آدم خور اور جنگلی قاتل

تعارف

وقت اور تہذیب ہمیشہ آگے کو بڑھتے ہیں اور اپنے ساتھ صنعتی انقلاب، بہتر معیارِ زندگی اور آسائشیں بھی لاتے ہیں مگر اس کی قیمت بھی ادا کرنی پڑتی ہے جو بتدریج کم ہوتی ہوئی فطرت ہوتی ہے۔ انسانی تخلیقات اور تعمیرات سے فطرت کا چہرہ داغدار ہوتا جاتا ہے۔ ہر روز، ہر منٹ بعد جنگل کے دیو، کئی کئی سو سال پرانے درخت گرائے جاتے ہیں، چاہے وہ تعمیراتی لکڑی کے حصول کے لیے ہوں یا پھر مشینی ثقافت کا پھیلاؤ ہو، جس سے معدودے چند افراد ہی محظوظ ہوتے ہیں اور بعض اوقات خوفناک مظالم بھی ڈھائے جاتے ہیں۔ درختوں کے ساتھ کئی اور چیزیں بھی رخصت ہوتی ہیں، چاہے وہ جنگلی جانور ہوں، پرندے ہوں یا اس خوبصورت دھرتی پر رہنے والی دیگر مخلوقات جو بہت تیزی سے ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔

بہت عرصہ قبل یہی ظلم امریکی گھاس کے میدانوں کے ساتھ ہوا جہاں کبھی بے شمار ارنے بھینسے موجود تھے اور آج وہاں ان کا نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ افریقہ اسی نقشِ قدم پر تیزی سے چل رہا ہے۔ کبھی اس براعظم پر خوبصورت جانوروں کے بے شمار ریوڑ ہوتے تھے۔ کچھ تو ابھی تک موجود ہیں جو ہزاروں میل کے فاصلے پر پھیلے ہوئے ہیں جبکہ دھوپ میں دیگر کی چمکتی ہڈیاں انسانی ہاتھوں ان کی تباہی کی گواہ ہیں۔ ہاتھیوں کو تجارتی پیمانے پر شکار کیا جاتا رہا تھا اور ایک ایک شکاری کئی کئی ہزار ہاتھیوں کا قاتل بنا۔ ہندوستان میں بھی جنگلی جانوروں کی تیزی سے کم ہوتی تعداد خطرے کی گھنٹی بجا رہی ہے۔ میں ایسی بہت سی جگہوں کو جانتا ہوں جہاں ۱۹۳۰ تک رات کو شیر کی دھاڑ اور تیندوے کی آواز عام سنائی دیتی تھی اور اس کے بعد سانبھر اور دیگر جانوروں کی خطرے

آوازیں بھی۔ اب رات خاموش گزرتی ہے اور واحد آواز جھینگر کی ہوتی ہے۔ جہاں کبھی شیر اور دیگر جانوروں کی شبینہ آمد و رفت کے پگ دکھائی دیتے تھے، اب وہاں چند خرگوشوں کے پگ بتاتے ہیں کہ وہ ابھی تک ناپید نہیں ہوئے۔ میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ کسی ملک میں اتنی بڑی تعداد میں جنگلی حیات کیوں اور کیسے ناپید ہوتی ہے۔ جس انسان نے کبھی جنگل کو سمجھا نہیں اور اس سے محبت نہیں کی اور اس میں موجود حیات سے تعلق نہیں پیدا کیا، وہ کبھی ان جذبات کو نہیں سمجھ سکتا اور نہ ہی اسے اس ناقابلِ تلافی نقصان کا احساس ہوگا کہ جنگلی حیات ناپید ہو گئی ہے۔ جہاں کبھی واقف آوازیں ہوتی تھیں، اب محض تباہی کے ہمراہ آنے والی خاموشی سنائی دیتی ہے۔

اس بات پر کسی کو شبہ نہیں کہ آنے والے وقت میں یہ چند بچے کھچے جانور بھی اپنے فطری ماحول سے ناپید ہو جائیں گے اور پھر جا کر یہ احساس ہوگا کہ کیسا ناقابلِ تلافی نقصان ہوا ہے۔ میں ان کہانیوں کو اس لیے نہیں بیان کر رہا کہ اس طرح لوگوں کی مہم جوئی کی تسکین ہوگی بلکہ میرا مقصد یہ بھی ہے کہ انسانی خواہشات میں سے ایک، شکار جیسا شغل کیسے ناپیدی کی طرف جا رہا ہے۔

اجزا

اکمپی کاری کا قاتل

اگر دو بلند پہاڑی سلسلوں کا تصور کریں جن کی اوسط بلندی ۴۰۰۰ فٹ سے زیادہ ہو اور ان کے درمیان پھیلی وادی پانچ میل چوڑی ہو، جس میں گھنا جنگل ہو تو آپ کو پتہ چلے گا کہ میری کہانی کس علاقے سے متعلق ہے۔ یہ کہانی ضلع سالم کے شمالی علاقے سے متعلق ہے جو جنوبی ہندوستان میں مدراس کے صوبے میں واقع ہے۔ یہ پہاڑیاں شمالاً جنوباً واقع ہیں اور مشرقی سلسلہ زیادہ بلند ہے۔ اس کے جنوبی کنارے پر واقع پہاڑی گتھریاں ہے جو ۴۵۰۰ فٹ سے زیادہ بلند ہے۔ اس کی ڈھلانوں پر کوڈی کاری کا بنگلہ ہے جہاں سے دنیا کے خوبصورت ترین مناظر میں سے کچھ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ہر سمت پہاڑیاں اور چٹانیں دکھائی دیتی ہیں۔ سورج صبح کے وقت گلابی رنگ کی دھند سے طلوع ہوتا ہے اور پھر تانبے جیسی رنگت چھوڑتا مغربی جانب غروب ہوتا ہے۔ پھر چاند طلوع ہوتا ہے اور اپنی سفید روشنی پھیلاتا ہے۔ چاند پہلے پہاڑیوں کے اوپر سے نکلتا ہے اور اس کی چاندنی پہاڑوں سے اترتی ہوئی آخر کار وادی میں داخل ہوتی ہے۔ رات بھر چاند کا سفر جاری رہتا ہے اور جنگل میں ہونے والے کئی حادثات بھی دیکھتا ہے۔ دم توڑتے سانبھر کی آواز ہو یا چیتل کی چیخ، چاندنی میں یہ چیخ و پکار بیکار جاتی ہے اور ان کی جان بھوکے شیر کے ہاتھوں چلی جاتی ہے۔

بیس سال سے زیادہ عرصہ ہوا، میری ملاقات افغانستان کے بادشاہ امان اللہ کے بھائی سے ہوئی جو جلاوطنی کا عرصہ کوڈی کاری کے بنگلے میں گزار رہے تھے کہ انہیں یہ جگہ بہت پسند تھی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ یہاں کے مناظر انہیں افغانستان کی یاد دلاتے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ کوڈی کاری کے آس پاس گھنا جنگل ہے جبکہ افغانستان کے پہاڑ بالکل خالی ہیں۔ تاہم دونوں آزادی کا احساس دلاتے ہیں۔ کمپی کاری چھوٹی سی وادی ہے جو مغربی ڈھلوان پر آباد ہے۔ اس کے آس پاس

کچھ کھیت ہیں اور کھیتوں کے پار بانس کا گھنا جنگل ہے جس میں سے ندی گزرتی ہے۔ میں اس وادی کو سپائیڈر ویلی یعنی مکڑیوں کی وادی کہتا ہوں کیونکہ یہاں بہت بڑی مکڑیاں اپنے جالے بنا کر رہتی ہیں جو عموماً ندی کے کنارے راستے کے درمیان بنے ہوتے ہیں۔ یہ ندی جنوب کو جاتے ہوئے وسیع ہوتی جاتی ہے اور اسے موراپور وادی کہا جاتا ہے۔ جہاں یہ ندی دریائے چنار سے جا ملتی ہے، اس مقام کو سوپا ٹھی کہا جاتا ہے جو دریائے کاویری سے دس میل دور ہے۔

میں نے اس علاقے کو اس لیے تفصیل سے بیان کیا ہے تاکہ قارئین کو تھوڑا بہت اندازہ ہو سکے کہ یہ کہانی کے واقعات کہاں پیش آئے تھے اور یہ بھی کہ یہ علاقہ کتنا خوبصورت ہے۔ یہاں سڑتی ہوئی نباتات، جنگل میں چھایا اندھیرا، دور کہیں شکار کی تلاش میں نکلے آدم خور شیر کی دھاڑ اور غراہٹ اور پھر چھا جانے والی ڈراؤنی خاموشی، جھاڑ جھنکار میں ہونے والی مدھم سرسراہٹ جو آدم خور کی ہوگی جو مہذب انسان کے خلاف اپنے داؤ آزما رہا ہوگا۔ خیر کہانی شروع کرتے ہیں۔

کمپی کاری آدم خور کے ظہور کے بعد شدید دہشت کا شکار تھا اور تین مقامی باشندے اس کا لقمہ بن چکے تھے۔ پہلا شکار ایک پجاری تھا جو ایک ماہ قبل گیارہ میل دور متھر سے کمپی کاری آیا تھا اور دوبارہ دکھائی نہ دیا۔ ان علاقوں میں ہاتھی بکثرت تھے اور بسا اوقات انسان کو مار ڈالتے تھے۔ سو جب پجاری کمپی کاری نہ پہنچا تو اس کی تلاش کے لیے بندے متھر روانہ ہوئے۔ شاید یہ لوگ پجاری کی بجائے اس کی قیمہ ہوئی لاش تلاش کرنے کا سوچ کر نکلے تھے جس کے آس پاس ہاتھی کے پیروں کے نشانات ہوں گے مگر انہیں ناکامی ہوئی۔ کمپی کاری سے پانچ میل دور انہیں نر شیر کے پگ دکھائی دیے جس کے ساتھ تھوڑا سا خون موجود تھا اور متوفی کی لاٹھی اور دھوتی بھی وہیں مل گئی۔

دس روز بعد ایک عورت مغرب کے وقت کنویں سے پانی بھرنے گئی مگر واپس نہ لوٹی۔ آٹھ بجے اس کے شوہر نے چند دوستوں کے ہمراہ لاٹھیوں سے مسلح ہو کر تلاش شروع کی تو آدھا بھرا ہوا پیتل کا گھڑا راستے پر پڑا مل گیا۔ تاہم عورت کا کوئی نشان نہ ملا۔

اگلی صبح لوگوں کی جماعت تلاش پر نکلی اور راستے میں انہیں عورت کی ساڑھی اور پھر آگے چل کر چاندی کی پازیب بھی مل گئی۔ آخر کار متوفیہ کی باقیات بھی مل گئیں۔ اس کا سر جھاڑی کے نیچے پڑا تھا جبکہ پیر اور ہاتھ اِدھر اُدھر پڑے تھے اور جسم کا باقی حصہ اور ادھ کھائی ہڈیاں بتا رہی تھیں کہ شیر بہت بھوکا تھا اور اس نے خوب پیٹ بھرا تھا۔

ایک مہینہ گزر گیا۔ کمپی کاری کے لوگ جیسے محاصرے میں آ گئے ہوں۔ نہ تو کوئی یہاں آیا اور نہ ہی یہاں سے باہر گیا۔ انسانی فضلے سے گھروں کے باہر اور اندر بدبو ناقابلِ برداشت ہو گئی۔ کیا باہر قاتل اپنے شکار کی تلاش میں نہیں پھر رہا؟ کیا پہلا آدمی جو حوائجِ ضروریہ پوری کرنے کے لیے باہر نکلتا، اسے شیر نہ لے جاتا؟ رات کے وقت اور مشکل ہو جاتی کہ انسان اور مویشی اور بسا اوقات ان کے کتے بھی گھروں کے اندر پھنس پھنسا کر بیٹھ جاتے اور دروازے کے سامنے شہتیر یا نہر سے لا کر وزنی پتھر رکھ دیے جاتے۔ ہر گزرتے روز کے ساتھ ہی گھروں میں غلاظت بڑھتی جا رہی تھی اور لوگ ان حالات میں زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔

تاہم کبھی کبھار بہترین احتیاط بھی کام نہ آتی۔ میرے دوست بیر اپچاری کا داماد مارا ایسی صورتحال سے دلبرداشتہ ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ آدم خور ہو یا نہ ہو، وہ گھر کے اندر گندگی پھیلانے کو تیار نہیں۔ رات کے اندھیرے میں وہ باہر جاتا اور فارغ ہو کر آ جاتا۔ ایک رات وہ

حسبِ معمول باہر نکلا مگر واپس نہ لوٹا۔ گھر کے اندر اس کی پریشان بیوی کہتی ہے کہ اس نے ہلکی سی دھپ کی آواز سنی تھی اور ساتھ ہی جیسے کسی کا گلہ گھونٹا جا رہا ہو، مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

پندرہ منٹ بعد اس نے شور مچا دیا۔ کوئی بھی مدد کو نہ آیا کہ سبھی خوفزدہ تھے۔ بند دروازوں کے پیچھے لوگ اس کی چیخم دھاڑ سنتے رہے۔ انہیں علم تھا کہ مارا اب انسانی مدد کی ضرورت سے دور چلا گیا ہے۔ مارا تو مر چکا مگر وہ سب زندہ تھے۔ پھر باہر جا کر کیوں خود کو ہلاکت میں ڈالا جائے؟ سو اس رات سبھی لوگ اپنے اپنے گھروں میں بیدار اور اس بیچاری کی چیخیں سنتے رہے۔

اگلی صبح نیم دلی کے ساتھ مارا کی باقیات تلاش کرنے کی کوشش ہوئی اور اگر شیر نے گاؤں سے دو سو گز کے فاصلے پر پیٹ نہ بھرا ہوتا تو مارا کی باقیات کبھی نہ مل پاتیں۔ کنویں والی عورت کی نسبت مارا کی باقیات کچھ زیادہ تھیں۔ شاید اس کا گوشت سخت ہو یا پھر شیر اتنا بھوکا نہ ہو؟ کون جانتا ہے۔ اس کا سر اور دھڑ ابھی یکجا تھے۔

میرا دوست بیرا اس وقت کمپی کاری میں تھا۔ جب اس کا داماد ہلاک ہوا تو اس نے اٹھارہ میل کا مشکل سفر کر کے پِنا گرام کا رخ کیا۔ اس سفر میں کوئی اس کا ساتھ دینے کو تیار نہ تھا، سو وہ اکیلا ہی آیا۔ اس نے نہ تو آدم خور کی کوئی آواز سنی اور نہ ہی اسے دیکھا۔ پِنا گرام میں وہ اپنے پرانے رفیق رنگا سے ملا اور یہ دونوں بس پر بیٹھ کر بنگلور آئے۔ نو بجے رات کو مجھے صدر دروازے کے باہر آوازیں سنائی دیں تو باہر جا کر دیکھا۔ اپنے پرانے دوستوں کو دیکھ کر مجھے حیرت کے ساتھ ساتھ بہت خوشی ہوئی۔

ضلع سالم نے اُن دنوں جسمانی، روحانی اور اخلاقی بہتری کے لیے شراب پر پابندی لگا دی تھی۔ چونکہ میرے دوست جسمانی، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے ترقی نہیں چاہتے تھے، سو میں نے انہیں

بہترین برانڈی پیش کی۔ تازہ دم ہو کر بیرا نے آدم خور کے بارے مختصراً بتایا۔ پھر اس نے صاف الفاظ میں مطالبہ کیا کہ اس کے داماد کا بدلہ میں نے ہی لینا ہے۔

اس بچگانہ اعتماد کے سامنے میرا کوئی بہانہ نہیں چل سکتا تھا۔ تین روز بعد میں اپنی سٹڈ بیکر چھوڑ کر باقی کے پیدل سفر پر روانہ ہوا۔ راستے میں مقامی دکانوں سے ہم نے ضرورت کا سامان خریدا اور چند گھنٹے بعد ہم اٹھارہ میل کا سفر پورا کر کے کمپی کاری پہنچ گئے کہ اس وادی میں کار کا جانا ممکن نہیں تھا۔

منزل سے دو میل قبل ہمیں شیر کے تازہ پگ دکھائی دیے جو پگڈنڈی پر تھے۔ اس راستے پر کئی روز سے کوئی انسان نہیں گزرا تھا اور نشانات واضح تھے۔ میں نے پگوں کا بغور جائزہ لیا تو اتنا پتہ چلا کہ اوسط جسامت کے نر شیر کے پگ ہیں۔ یہ علم نہیں ہو سکا کہ آیا شیر جوان ہے یا بوڑھا یا ادھیڑ عمر اور نہ ہی ہمیں یہ علم تھا کہ آیا یہی آدم خور شیر ہے یا پھر ادھر سے گزرنے والا کوئی عام شیر۔

کمپی کاری کے لوگوں سے ہمیں زیادہ معلومات نہیں ملیں۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ شیر بہت بڑی جسامت کا ہے۔ ظاہر ہے کہ عام لوگ جب دہشت کے عالم میں رہ رہے ہوں تو آدم خور کی جسامت اصل سے کئی گنا زیادہ بڑی دکھائی دیتی ہے۔

مسئلہ یہ تھا: اب کیا کریں یا کیسے آگے بڑھیں؟ جواب یہ تھا: اگلی واردات کا انتظار کریں یا پھر زندہ گارا پیش کیا جائے۔ چونکہ اس شیر نے ابھی تک اس دیہات کا کوئی بھی مویشی ہلاک نہیں کیا تھا، اس کا شکار ہمیشہ انسان ہی بنتے تھے۔ اب سوال یہ تھا: کوئی جانور باندھا جائے یا پھر کوئی انسان گارا بنے؟ اس کا واحد جواب یہ تھا کہ اگر گارا انسان نے بننا ہے تو یہ صرف میں ہی ہوں گا اور ظاہر ہے کہ مجھے یہ جواب انتہائی ناپسند تھا۔

بیرا، رنگا اور میں سر جوڑے چائے کی پیالیاں پیتے اور گفتگو کرتے رہے اور آخر کار ایک منصوبہ تشکیل پانے لگا۔ میں نے سوچا کہ پہلے حیوانی گارا پیش کیا جائے مگر ان دونوں کا خیال تھا کہ انسانی گارا بہتر رہے گا اور میں خود گارا بنوں تو مسئلہ جلد ہی حل ہو جائے گا۔ میری دلی خواہش تھی کہ ان کا منصوبہ اس سے مختلف ہوتا۔

تین افراد کی گفتگو میں دو کی رائے قطعی اکثریت شمار ہوتی ہے۔ تیسرے انسان کے پاس اور کوئی راستہ نہیں بچتا۔ تاہم میں نے یہ بات منوالی کہ انسانی گارے کے ساتھ ساتھ ہمیں حیوانی گارا بھی باندھنا چاہیے تاکہ شیر کو زیادہ سے زیادہ لبھایا جاسکے۔

کمپی کاری میں بھینسے نہیں تھے، سو میں نے دو بیل خریدے جن میں سے ایک کو اس جگہ باندھا جہاں آتے ہوئے شیر کے پگ دکھائی دیے تھے اور دوسرے کو وادی کے نچلے سرے پر بل کھاتی ہوئی مگر خشک ندی کی تہہ میں باندھا۔ میں کنویں کی منڈیر سے ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھا۔ میں نے کنویں کی رسی سے ایک دھاتی برتن باندھ کر پاس ہی رکھا لیا تھا۔ بوتل کی نسبت تازہ پانی ہمیشہ بہتر رہتا ہے۔

کنویں سے پچاس گز کی دوری پر تین سمت جنگل تھا۔ اس جگہ کسی نے پپیتے کے دس بارہ درخت لگا دیے تھے۔ کنویں سے بہنے والے پانی سے ان درختوں کے نیچے گھاس اور کچھ جھاڑیاں اگ آئی تھیں۔ دن کی روشنی میں تو یہ بہت معمولی دکھائی دیتی تھیں مگر دھندلکے اور اندھیرے کے دوران مجھے اندازہ ہوا لگا کہ شیر کی آمد کا یہ بہترین راستہ ہو سکتا ہے۔ یہاں شیر جست لگانے کے لیے مناسب فاصلے تک پہنچ جاتا اور مجھے اس کا علم بھی نہ ہو پاتا۔

یہ سوچ آتے ہی میں نے اپنا مقام بدل کر کنویں کے دوسرے ستون سے ٹیک لگا لی اور اب بیپتے کے درخت میرے سامنے تھے۔

میں نے اس جگہ بیٹھنے کا فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ چاند کی تیرہ تاریخ تھی۔ غروبِ آفتاب کے ساتھ ہی چاند نکل آتا مگر میں یہ بھول گیا تھا کہ مشرق میں پہاڑیوں سے چاند کو بلند ہونے میں کچھ وقت لگتا اور پھر اس کی چاندنی آٹھ بجے پہنچتی۔ یہاں اپنی زندگی کے بدترین ڈیڑھ گھنٹے انتظار کی تکلیف سہنی پڑی۔ میں بتا نہیں سکتا کہ جب چاندنی کی اولین کرنیں یہاں پہنچیں تو میں کتنا خوش ہوا۔

اس سے مجھے کملا پور میں گزاری ہوئی راتیں یاد آ گئیں جہاں میں جھونپڑے میں چھپ کر تیندوے کا انتظار کرتا رہا اور دن کو ٹیک کے درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھتا اور سوچتا کہ کیا میں یہ حماقت پھر سے کبھی دہراؤں گا؟ تاہم عقلِ سلیم بتاتی تھی کہ یہی واحد حل تھا۔

رات خاموش تھی اور عام شبینہ پرندے بھی میرے قریب نہیں آئے۔ گرم دن گزارنے کے بعد چند چمگادڑیں اڑتے ہوئے پانی پینے آئیں۔ میں بیپتے والی سمت کے علاوہ بھی ہر سمت نگراں رہا۔ چشمِ تصور سے مجھے ہر جانب سے آدم خور شیر آتے محسوس ہوتے رہے جو میری حدِ نگاہ سے ذرا پیچھے ہوں گے۔ میں کنویں کی منڈیر پر چپکا بیٹھا رہا اور اعشاریہ ۴۰۵ بور کی رائفل میرے ہاتھوں میں اور انگوٹھا ٹارچ کے بٹن پر تھا۔

ایسے وقت انسانی دماغ میں آنے والے خیالات عجیب اور ناقابلِ توجیہ ہوتے ہیں مگر میں انہیں سنا کر آپ کو کیوں پریشان کروں۔ پہلے پہل شیر کے بارے خیالات یہ تھے کہ یہ قسمت کا بدلا ہوگا۔ پھر کچھ دیر بعد شیر کا خیال ذہن سے نکل گیا۔

آٹھ بجے کے بعد مشرقی پہاڑ کے اوپر آسمان روشن ہونے لگا، روشنی تیز ہونے لگی اور ستارے مدھم پڑنے لگے۔ پھر چاند نمودار ہوا اور میرے آس پاس کی جگہیں روشن ہو گئیں تو میری پریشانی ختم ہوئی۔ جب چاند آسمان پر اوپر اٹھا تو روشنی بڑھنے لگی اور مجھے پپیتے کے تنوں کے درمیان کا منظر بھی دکھائی دینے لگا۔ رات کے پہلے نصف حصے میں کوئی آواز بھی سنائی نہ دی۔

گیارہ بجے کے بعد نر سانبھر نے ندی کی جانب سے آواز دی۔ میرا ایک گارا وہیں بندھا ہوا تھا۔ اس آواز میں خطرے اور تنبیہ کا عنصر واضح تھا۔ یہ آواز بار بار آئی اور پھر دور ہوتے ہوتے غائب ہو گئی۔ شاید سانبھر مخالف سمت کی پہاڑیوں پر چڑھ کر خطرے سے دور نکل گیا ہو گا۔

ایک بار پھر خاموشی چھا گئی اور رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اگر میں کنویں سے پانی نکالنے کی کوشش کروں تو چرخی کی آواز ایک میل دور موجود شیر بہ آسانی سن لے گا۔ دن کے وقت میں نے دیکھ لیا تھا کہ کنویں کی چرخی بہت زیادہ شور کرتی تھی۔ اگر شیر یہ آواز سنتا تو یہی سوچتا کہ کوئی انسان پانی بھر رہا ہو گا۔

سو میں نے کنویں کی دوسری جانب جا کر ڈول اٹھایا۔ پھر میں نے اپنی رائفل کنویں کے ساتھ کھڑی کی اور پھر ڈول نیچے پھینکا اور پھر اسے آہستگی سے کھینچنا شروع کر دیا۔ میں نے یہی عمل بار بار دہرایا۔ رات کی خاموشی میں چرخی کا شور دور دور تک سنائی دے رہا تھا اور میں نے لگ بھگ ایک گھنٹہ یہ مشق جاری رکھی۔ ہر چند منٹ بعد رک کر میں آس پاس کا بغور جائزہ لیتا۔ میری خصوصی توجہ درختوں کے نیچے بننے والے سایوں پر ہوتی تھی۔ تاہم کوئی حرکت نہ دکھائی دی نہ ہی جھاڑیوں سے کسی چوہے کی حرکت کی آواز آئی۔ بظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ جھونپڑوں کے اندر موجود لوگوں کے علاوہ یہ چوہے ہی اس علاقے میں واحد ذی روح ہوں۔

تین بجے کے بعد چاند مغربی پہاڑیوں کے پیچھے جانے لگا اور شام والی صورتحال پھر سامنے آئی۔ بتدریج تاریکی چھاتی رہی اور جلد ہی چند گز دور کی چیزیں اوجھل ہو گئیں۔ چاند غائب ہونے کے بعد ستاروں کی روشنی تیز ہونے لگی۔

تاریکی کے محض نوے منٹ تھے مگر مجھے بہت زیادہ نیند آنا شروع ہو گئی۔ اب مجھے پہلے سے زیادہ محتاط ہونا تھا کہ میں ایک گھنٹے سے آدم خور کو بلا رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ ساری رات وہ کہیں اور رہا ہو اور اب یہاں پہنچا ہو؟ ویسے بھی اچانک حملے کے لیے تمام تر حالات اس کی حمایت میں تھے کیونکہ پیپتے کے درخت پھر تاریکی میں ڈوب چکے تھے۔

اگر آدم خور حملے کا فیصلہ کرتا تو میں پوری طرح اس کے رحم و کرم پر ہوتا۔ تاہم اگر وہ دھاڑ کر حملہ بھی کرتا تو بھی میں انتہائی قریب سے اپنی رائفل چلا سکتا تھا۔ اگر وہ خاموشی سے حملہ کرتا تو مجھے اتنی مہلت بھی نہ ملتی۔

عین اسی وقت کنویں کے آس پاس موجود تمام چوہوں اور خرگوشوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ ان کی بھاگ دوڑ، خشک پتوں پر ان کی حرکات جو کبھی تو بلند ہوتیں اور کبھی محض ہلکی سی، جس سے شبہ ہوتا کہ آدم خور حملے کے لیے تیار ہو رہا ہو گا۔

بحیثیتِ مجموعی بہت مشکل وقت گزرا۔ صبحِ کاذب آئی اور چلی گئی اور پھر پونے چھ بجے مشرقی جانب آسمان کا رنگ ہلکا پڑنا شروع ہو گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ سورج طلوع ہونے والا ہے اور رت جگا اپنے اختتام کو پہنچا۔ تاہم سورج سات بجے کے بعد جا کر پہاڑوں کے اوپر نکلا۔ پھر میں اپنی نشست سے اٹھا اور گاؤں کے جنوبی سرے پر لگے اپنے خیمے کو چل دیا۔

گرما گرم چائے پی کر میں سو گیا۔ ساڑھے دس اٹھ کر میں نے رنگا اور بیرا کے ساتھ نہر میں بندھے پہلے گارے کا چکر لگایا۔ گارا زندہ سلامت تھا۔ پاس جا کر دیکھا تو پتہ چلا کہ شیر اس کے پندرہ فٹ قریب تک آیا اور پھر اس کو دیکھ کر چلا گیا۔

رات کو سانبھر شیر کو ہی دیکھ کر خطرے کا اعلان کر رہا تھا۔ شیر کے پگ نرم اور خشک ریت پر واضح تھے مگر یہ کہنا مشکل تھا کہ آیا یہ وہی شیر ہے جس کے پگ ہم نے آتے ہوئے مغربی سمت دیکھے تھے۔ اُس جگہ زمین نرم نہیں تھی، سو شیر کے پگ اپنی اصل جسامت کے دکھائی دیے تھے۔ تاہم مجھے پورا یقین تھا کہ یہ شیر آدم خور ہے، کیونکہ عام شیر اس طرح گارے کو دیکھ کر واپس نہ مڑتا۔

پھر ہم دوسرے گارے کو روانہ ہوئے۔ وہاں جا کر دیکھا تو حیرت ہوئی کہ اسے شیر نے ہلاک کر دیا تھا۔ یہاں شیر کے پگ پچھلے روز والے پگوں جیسے تھے جو اس کے قریب دیکھے تھے۔

اب سوال یہ تھا: اس علاقے میں کیا دو شیر ہیں یا پھر دوسرے شیر کو آدم خور نے ہی ہلاک کیا ہے؟ اگر ایک ہی شیر ہے جو کہ آدم خور ہے تو اس نے پہلے گارے کو کیوں چھوڑ دیا اور دوسرے کو کیوں مارا؟

میرا یہ خیال تھا کہ اس جگہ دو شیر ہیں اور پہلے گارے کو آدم خور نے دیکھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ رنگا کا بھی یہی خیال تھا۔ تاہم بیرا اس سے متفق نہیں ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ اس علاقے میں ایک ہی شیر ہے جو آدم خور ہے۔ پہلے بیل کو اس نے اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ وہ بیل سفید رنگ کا تھا۔ دوسرا بیل بھورا تھا، سو اسے کوئی شک نہیں ہوا۔

گارے کے رنگ کے بارے مجھے کوئی مسئلہ نہیں۔ میرے تجربے کے مطابق شیر کے لیے گارے کا رنگ کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور اگر دیگر شرائط پوری ہوں تو وہ ہر رنگ کے گارے کو مارنے پر تیار

ہو جائے گا۔ ایک تو یہ کہ شیر کو بھوک لگی ہو کہ شیر بے فائدہ شکار نہیں کرتا۔ دوسرا اسے کسی قسم کا شبہ نہ ہو۔ آج کل چونکہ شیروں کا شکار زوروں پر ہے، شیر بھی محتاط ہوتے جا رہے ہیں۔ فطرت تیزی سے ناپید ہوتی انواع کو بچنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔

اگر گارے کی گردن سے رسی بندھی ہو تو شیر شاید ہی اسے ہاتھ لگائے۔ اگرچہ وہ سوچ تو نہیں سکتا، مگر اس کی فطرت اسے بتاتی ہے کہ انسان کے لیے فطری بات نہیں کہ وہ اپنے مویشی جنگل میں رات کو باندھ جائیں۔ سینگوں سے بندھے جانور کے شکار ہونے کے زیادہ امکانات ہیں کہ شیر سمجھے گا کہ اس جانور کے سینگ جھاڑیوں میں پھنس گئے ہوں گے۔ اسی طرح پچھلی ٹانگ سے بندھی رسی والا گارا بھی آسانی سے مارا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ شیر اور تیندوے، دونوں اپنے شکار کا گلا دبوچتے ہیں اور اس سلسلے میں کوئی بھی رکاوٹ انہیں شبہے میں ڈال دیتی ہے۔

تیندوے عموماً اس بارے شیر جتنے محتاط نہیں رہتے۔ ذاتی طور پر میں تیندوے کے لیے کتے کو بطور گارا استعمال کرنے کو ظلم سمجھتا ہوں کہ کتا بہت سمجھدار جانور ہے اور اسے بخوبی علم ہوتا ہے کہ اسے کیوں باندھا گیا ہے۔ حملہ ہونے تک اسے شدید ذہنی عذاب سہنا پڑتا ہے۔ جوانی میں میں پوری کوشش کرتا تھا کہ گارے کے طور پر باندھے گئے کتے کی جان بچانے کی ہر ممکن کوشش کروں۔ اس لیے میں نے چار انچ چوڑا چمڑے کا پٹہ بنوایا تھا جس میں چمڑے کی دو تہیں ہوتی تھیں اور بیرونی تہہ سے نکلے ہوئے دو دو انچ لمبے تیز کیل ہوتے تھے۔ جب تیندوا حملہ کرتا اور کیل اس کے منہ میں چبھتے تو تیندوا اچھل کر پیچھے ہٹتا۔ اس پر مجھے بڑی ہنسی آتی۔ جتنی دیر تیندوا اس معمے کو حل کرتا، میں اسے شکار کر لیتا۔ ایسے شعبدے شیر کے سامنے کام نہیں کرتے۔

بیمار جانور کا گارا بھی ناکام رہتا ہے۔ نیلگری پہاڑوں میں رہنے والے بڈاگا قبیلے کے لوگ گارے کے لیے صحت مند جانور نہیں بیچتے، چاہے ان کو کتنی قیمت دی جائے۔ ان کے خیال میں اچھے بیل کی قربانی گناہ ہوتی ہے۔ اس لیے وہ قریب المرگ بیمار جانور بیچتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ منہ کھر کی بیماری میں قریب المرگ ایک بیل میں نے گارے کے لیے باندھا۔ مسلسل تین راتوں تک شیر اس کے گرد چکر لگایا کرتا اور ایک بار تو وہاں بیٹھ بھی گیا تھا مگر پھر اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ چوتھی رات میرا بیٹا مچان پر بیٹھا اور آٹھ بجے بیل کا وقت پورا ہو گیا۔ بیل نیچے گرا اور ساری رات ایڑیاں رگڑنے کے بعد صبح مر گیا۔ اس رات شیر غائب رہا۔

گارے کی رنگت کے بارے شکاریوں کی رائے مختلف ہوتی ہے۔ کچھ لوگ سفید جانور باندھنے سے کتراتے ہیں کہ ان کے مارے جانے کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ ماضی قریب میں تیندوؤں کا مشہور شکاری کالی بکری باندھنے کے خلاف تھا کہ اس طرح تیندوا ضرورت سے زیادہ محتاط ہو جاتا ہے۔ اس شکاری نے سو سے زیادہ تیندوے مارے تھے۔

میں اصل موضوع سے ہٹ کر اس لیے تفصیل بتا رہا تھا کہ بہت سارے لوگ تیندوے اور شیر کے شکار کا طریقہ جاننے کے مشتاق ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ہم دوسرے شکاریوں کی 'خوش قسمتی' کے ڈھیروں قصے سنتے ہیں، مگر یاد رہے کہ یہ خوش قسمتی دراصل ماضی کے ان گنت تجربات کا نچوڑ ہوتی ہے جو کسی شکار کو کامیاب یا ناکام بناتی ہے۔

خیر، اصل کہانی کو لوٹتے ہیں۔ اب اس ادھ کھائے بیل پر مچان باندھنا رہ گیا تھا۔ تجربات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم نے دونوں گارے مناسب درختوں کے نیچے باندھے تھے۔ جتنی دیر میں جا کر نیند پوری کرتا، رنگا اور بیرا نے میری کینوس والی کرسی کو مچان کے طور پر باندھ دیا۔ دونوں ہی

اس کام کے ماہر تھے۔ میرے خیال میں چار پائی کے بعد دوسری بہترین مچان تہہ ہونے والی کرسی ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ چار پائی کی مانند بڑی اور آرام دہ تو نہیں ہوتی مگر اس کو تہہ کرنا اور منتقل کرنا سہل ہوتے ہیں۔

پانچ بجے میں رت جگے کے لیے تیار ہو کر مچان پر پہنچ گیا۔

یہ مقام کمپی کاری سے بلند اور مغربی پہاڑیوں پر تھا، سو گاؤں میں گزشتہ روز کی نشست کی نسبت چاندنی یہاں جلدی پہنچ جاتی تھی۔ جب مغربی پہاڑیوں پر سورج غروب ہوا تو چاند مشرقی سرے سے نکل آیا تھا اور آس پاس صاف دکھائی دینے لگا۔

آٹھ بجے اچانک مجھے احساس ہوا کہ شیر میرے عین نیچے کھڑا ہے۔ وہ یہاں کس سمت سے اور کیسے آیا، مجھے علم نہیں۔ چونکہ یہ راستہ دونوں طرف مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا، سو شیر کی آمد کسی اور راستے سے ہوئی ہو گی۔ مجھے شیر کی موجودگی کی اطلاع تب ہوئی جب شیر نے درخت کے تنے سے اپنے جسم کو رگڑنا شروع کیا۔ اس دوران اس نے سر اٹھایا اور مجھے دیکھ لیا۔

پھر اس نے فوری ردعمل دکھایا۔ دھاڑ لگا کر اس نے درخت پر چڑھنا شروع کیا۔ خوش قسمتی سے ہم نے نسبتاً سیدھے تنے والا درخت چنا تھا اور پہلی شاخ پندرہ فٹ پر تھی جہاں میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہی آدم خور ہے، ورنہ عام شیر تو انسان کی موجودگی سے ہی فرار ہو جاتے ہیں۔

میں نے فوراً اپنی ٹانگیں اوپر کو اٹھائیں اور بائیں جانب جھک کر نیچے دیکھا۔ بد قسمتی سے میں غلط جانب مڑا تھا کیونکہ شیر دائیں سمت سے چڑھ رہا تھا۔ میں نے فوراً سمت بدلی مگر اب مجھے بائیں شانے سے گولی چلانی تھی۔

آپ کو یہ پڑھنے میں جتنا وقت لگا، اصل واقعات اس سے کم وقت میں رونما ہوئے۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ میری نشست زمین سے پندرہ فٹ بلند تھی۔ ناک سے دم کے سرے تک شیر کی لمبائی نو فٹ اوسط شمار ہوتی ہے۔ اگر دم کو نکال کر آگے کو بڑھے ہوئے پنجے شمار کر لیں تو پچھلے پیروں پر کھڑے شیر کی اونچائی آٹھ فٹ بنتی ہے۔ اب آپ پندرہ فٹ سے آٹھ فٹ منفی کریں تو باقی سات فٹ بچتے ہیں جو اس رات شیر چڑھنے میں کامیاب رہا۔ مجھ پر حملہ کرنے کے لیے اس نے پنجے کو پھیلا کر کرسی پر وار کیا اور اس کے ناخن کرسی کو پھاڑتے ہوئے میری پتلون کو چیر گئے۔ اس دوران شیر کا توازن بگڑا اور وہ زمین پر گرا۔ شیر سے بچنے کے لیے میں کرسی سے اوپر اٹھا اور شکر ہے کہ میں رائفل سمیت شیر کے پیچھے نیچے نہیں گرا۔

آدم خور شیر ہو یا تیندوا، دونوں انسانوں پر پیچھے سے حملہ کرتے ہیں کہ عموماً وہ بزدل ہوتے ہیں۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے جب حملہ سامنے سے ہو یا جب شکار ان کی موجودگی سے خبردار ہو جائے تو بھی وہ حملہ کریں۔

اس رات بھی یہی ہوا۔ جب شیر زمین پر گرا تو اسے پتہ تھا کہ اس کی موجودگی راز نہیں رہی۔ زمین پر پہنچتے ہی اس نے زقند لگائی اور دھاڑ کے ساتھ جھاڑیوں میں گم ہو گیا۔

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ شیر فرار ہو گیا۔ ورنہ اپنے عین نیچے گولی چلاتے ہوئے عین ممکن تھا کہ رائفل میرے ہاتھ سے گر جاتی یا میں خود کرسی سے گر جاتا۔ شکر ہے کہ شیر نے فرار کو ترجیح دی۔

میری موجودگی بھی اب خفیہ نہ رہی تھی اور اب حرکت یا آواز کرنے میں کوئی مسئلہ نہ تھا۔ سو اپنا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ شیر کا پنجہ جہاں لگا تھا، کرسی پر پانچ انچ لمبی تین خراشیں تھیں۔ ان میں سے

دو میری پتلون سے بھی پار ہوئی تھیں اور میرے کولہوں پر خراشیں پڑیں جو اب تکلیف دے رہی تھیں۔

عام طور پر لوگ اس بات پر ہنس پڑیں مگر یاد رہے کہ تمام گوشت خور درندوں کے پنجوں کے نیچے زہریلے جراثیم پل رہے ہوتے ہیں اور آدم خوروں پر بھی یہی اصول لاگو ہوتا ہے۔ کرسی کی نشست اور میری پتلون، دونوں اتنی موٹی نہیں تھیں کہ جراثیم کو روک سکتیں۔ اب میرے زخم بگڑنے کا امکان تھا۔

میں اپنے ساتھ ابتدائی طبّی امداد کا کافی سامان لایا تھا جس میں پانچ سی سی کی سرنج اور پروکین پینسلین بھی شامل تھی۔ تاہم یہ سب سامان کمپی کاری میں میرے خیمے میں یہاں سے دو میل دور رکھا تھا۔ اب دو راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ ابھی واپس روانہ ہو جاتا اور جا کر دوائی استعمال کرتا یا پھر صبح تک انتظار کرتا جو کم از کم دس گھنٹے دور تھی اور تب تک جراثیم زخموں میں پھیل جاتے۔ تاہم اگر ابھی واپس جاتا تو آدم خور کے حملے کا اندیشہ تھا۔ تاہم دوسری جانب اگر زخم بگڑ جاتے تو میں آدم خور کا مقابلہ کرنے سے معذور ہو جاتا۔

آدم خور کو بھلا کر رائفل کو نیچے اتار کر میں بھی اترا اور خلوصِ دل سے دعا کرتا رہا تھا کہ میرے اترنے کے دوران آدم خور حملہ نہ کرے۔ زمین پر پہنچ کر میں نے درخت کے تنے سے ٹیک لگائی اور رائفل کو رسی سے الگ کیا۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ عین ممکن تھا کہ شیر دس میل دور ہوتا یا پھر نزدیکی جھاڑی کے پیچھے چھپا ہوتا۔ چاندنی خوب چھٹکی ہوئی تھی اور جنگل سے پھولوں کی خوشبو ہوا کے جھونکوں کے ساتھ آ رہی تھی۔

چند لمحے رکنے کے بعد میں نے کمپی کاری کے دو میل سفر کا آغاز کیا۔ زمین کی نوعیت اور نباتات کے مطابق اس راستے کی چوڑائی بدلتی رہتی ہے اور بعض جگہ پندرہ فٹ تو بعض جگہ محض ایک گز چوڑا رہ جاتا ہے۔ بعض جگہوں پر اس کے اطراف میں اونچی گھاس اور خاردار بیلیں آ جاتی ہیں۔ راستے میں بانس کے جھنڈوں والی کئی ندیاں آتی ہیں اور ہوا میں جھولتے ہوئے ان کے تنے زمین پر عجیب عجیب سائے بناتے ہیں۔

ایسے مواقع پر دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے اور انسانی اعصاب ہر آواز کو آدم خور کے حملے سے جوڑ دیتے ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ رفتار تیز رکھی جائے۔ دماغ کہتا ہے کہ ایک طرف دیکھو اور پھر فوراً خیال آتا ہے کہ کہیں آدم خور دوسری جانب سے حملہ نہ کر دے۔ تاہم ان تمام جذبات پر قابو رکھنا چاہیے ورنہ انسان ہیجان کا شکار ہو جائے گا اور ہیجان میں انسان خبردار نہیں رہ سکتا اور نتیجہ تباہی کی صورت میں نکلتا ہے۔

اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ انسان اپنے سامنے جھاڑیوں میں چھپے شیر کی موجودگی سے خبردار ہو کیونکہ چلتے ہوئے انسان پر عقب سے اگر حملہ ہو تو شیر کچھ نہ کچھ آواز پیدا کرے گا۔

اس لیے عقلمندی کا تقاضا ہے کہ پوری توجہ سامنے رکھی جائے مگر کسی جھاڑی کے پاس سے گزرتے ہوئے کنکھیوں سے دیکھ لینا چاہیے مگر سر کو حرکت نہ دی جائے۔ اپنی رائفل کو مستقل فائر کے لیے تیار اور بغل میں رکھنا چاہیے کہ گولی کولہے یا پیٹ پر رائفل رکھ کر بھی چلانا پڑ سکتی ہے۔ رائفل کو شانے پر لانے اور نشانہ لینے کا وقت نہیں ملتا کیونکہ قاتل چاہے انسان ہو یا حیوان، کبھی اپنی موجودگی کا اعلان نہیں کرتا۔ اگر ایسا ہونے لگے تو قاتل کو مقتول بنتے وقت نہیں لگے گا۔

اگر آپ کا مطلوبہ جانور زخمی ہو تو شاید وہ غرا کر یا دھاڑ کر خبردار کرے اور پھر فلک شگاف دھاڑ کے ساتھ حملہ کرے گا۔ تاہم اگر شیر زخمی نہ ہو اور آدم خور بھی ہو تو پلک جھپکتے سر پر ہو گا۔

کمپی کاری سے چوتھائی میل پہلے راستے کے دونوں جانب چٹانی چھجے سے بنے ہوئے ہیں۔ پورے راستے میں یہی سب سے خطرناک مقام ہے کہ یہاں آدم خور کسی بھی پتھر کے پیچھے چھپ سکتا ہے۔ تاہم چونکہ اس نے فرار ہوتے ہوئے مخالف سمت کا رخ کیا تھا، سو میں نے سوچا کہ اسے اتنا وقت نہیں ملا ہو گا کہ وہ مڑ کر یہاں پہنچ سکتا۔ اس تسلی کی وجہ سے میں بعافیت یہاں سے گزر کر کمپی کاری اور پھر اپنے خیمے کو پہنچا۔

میری عدم موجودگی میں ہمیشہ کی طرح رنگا اور بیرا جاگ رہے تھے کہ مجھے کسی وقت بھی ان کی مدد کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ انہیں آگ جلا کر پانی گرم کرنے کا کہہ کر میں نے قہوہ پیا جو تیار تھا اور پھر اپنی سرنج نکال کر میں نے گرم پانی میں جراثیم سے پاک کی۔ پھر پروکین پینسلین کے ۸ لاکھ یونٹ والے دو وائل مکس کیے اور خود کو ٹیکہ لگایا۔

پھر میں نے رنگا اور بیرا سے کہا کہ وہ پوٹشیم پرمیگانیٹ کے طاقتور محلول سے میرے زخموں کو دھوئیں اور پھر مرہم لگایا۔ زخم ایسی جگہ تھا کہ پٹی یا پلستر نہیں لگ سکتا تھا، سو میں سونے چلا گیا۔

کئی رت جگوں اور بے آرامی کے بعد میں آرام سے جو سویا تو صبح نو بجے کے قریب آنکھ کھلی۔ جنگل میں کوئی اتنا تاخیر سے نہیں اٹھتا کہ ہر کوئی سورج طلوع ہونے سے قبل ہی بیدار ہو کر کام پر لگ جاتا ہے۔ میں نے زخموں میں زیادہ تکلیف نہیں محسوس کی۔

مزید چار لاکھ یونٹ کا ٹیکہ لگا کر زخموں پر مرہم لگایا اور پھر دلیے، بیکن اور انڈوں کا بھرپور ناشتہ کیا اور پھر پکا ہوا پپیتہ کھایا جو کنوئیں کے پاس والے درختوں سے آیا تھا۔

پھر میں نہر والے گارے کی سمت چل پڑا جو آج بھی سلامت تھا۔ پھر دو میل دور میں گزشتہ رات والے مقام پر گیا جہاں دیکھا کہ شیر نے بیل کی لاش کو چھوا تک نہیں تھا۔ اس کے پگوں سے پتہ چلا کہ یہ وہی پہلے روز والا شیر تھا۔

نیلگری اور چتوڑ کے برعکس سالم کے جنگلات زیادہ تر خار دار ہیں اور امبل اور مڑے کانٹے والے درخت بکثرت ہیں۔ وادیوں اور ندیوں کے کنارے البتہ بانس اگے ہوتے ہیں جو گنجان ہوتے ہیں۔ تاہم ان کا بھی نقصان ہی ہے کہ یہاں گھومنا پھرنا یا چھپ کر پیش قدمی انتہائی دشوار ہو جاتی ہے۔

درندے انتہائی خاموشی سے حرکت کرتے ہیں کیونکہ ان کی بقا کا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ دیکھ بھال کر قدم رکھیں تاکہ آواز نہ ہو۔ پھر ان کا پچھلا پنجہ عین اگلے پنجے والی خالی جگہ پر پڑتا ہے۔ انسان کو بھی انتہائی احتیاط سے چلنا ہوتا ہے۔ اسے ہر قدم کے لیے جگہ کو دیکھنا ہوتا ہے کیونکہ خشک پتے اور چھوٹی سی ٹہنی پر بھی پاؤں پڑا تو آواز پیدا ہو گی۔ پھر کانٹے دار جھاڑیوں سے بچنا لازمی ہے ورنہ کپڑوں یا جلد میں گھسنے والا ایک کانٹا بھی پیش قدمی کو روک سکتا ہے۔ اس طرح آپ کی توجہ بٹ جائے گی اور چونکہ آدم خور شیر کانٹوں سے نہیں الجھتا، سو نقصان آپ کا ہی ہو گا۔

اس جگہ جنگل انتہائی خار دار تھا، سو ہم کمپی کاری لوٹے اور گاؤں کے بزرگوں کے ساتھ سوچ بچار شروع کی۔ اب تک یہ حقائق سامنے آئے تھے:

آدم خور شیر نر اور اوسط جسامت کا تھا

مٹر گشت کے لیے اس کا پسندیدہ علاقہ مغربی پہاڑی سلسلے والا راستہ تھا

اسے بیل کے گوشت سے خاص دلچسپی نہیں تھی

یہ بات بھی یقینی نہیں تھی کہ یہاں صرف ایک شیر ہے یا دو شیر

ان لوگوں سے بات کر کے ہم اسی نتیجے پر پہنچے جو پہلے روز تھا۔ یعنی یا تو اگلے انسانی شکار کا انتظار کریں یا پھر اسے زندہ انسان کا گارا پیش کریں جو اس جگہ ہو جہاں کمپی کاری آنے والا راستہ مغربی پہاڑوں سے نیچے اترتا ہے۔ اس کے علاوہ جنگل میں دو اور بیل بھی باندھ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا کہ اس سے پتہ چلتا کہ یہاں کوئی دوسرا شیر تو موجود نہیں۔

شیر کے پنجوں سے لگی خراشیں ایسی جگہ تھیں کہ پندرہ منٹ سے زیادہ ایک حالت میں بیٹھنا ممکن نہ تھا۔ اس طرح شیر کے لیے چھپ کر 'بیٹھنا' ممکن نہ رہا۔ تاہم اگر میں ہی گارا بنتا تو ظاہر ہے کہ میرے بے حس و حرکت بیٹھنے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی۔ الٹا حرکت کرتے رہنے سے شیر زیادہ متوجہ ہوتا۔ مگر اس طرح زخموں کے بھرنے کا عمل متاثر ہوتا بلکہ تکلیف دہ بھی۔

دوسرا متبادل کھڑے ہونے یا لیٹنے کا تھا۔ ساری رات کھڑا رہنا تو ممکن نہیں سو واحد طریقہ لیٹ جانا تھا۔

سارا دن ہم سوچتے رہے اور پھر اپنے خیال میں بہترین حل پر پہنچے۔ اب یہ بہترین کتنا بہترین تھا، آگے چل کر آپ بھی دیکھیں گے۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ کمپی کاری کو آنے والا راستہ کئی نالوں سے گزرتا ہے اور جگہ جگہ بانس کے گھنے جھنڈ اور جھاڑ جھنکار بھی پائے جاتے ہیں۔ انھی نالوں کی تہہ میں میرے منصوبے کے لیے مناسب جگہ موجود تھی۔

سو کمپی کاری کے قریب ترین گزرنے والے نالے کے ساتھ ہی ایک درخت پر میں پچھلی رات بیٹھا تھا اور یہ نالہ سب سے زیادہ چوڑا تھا اور اس میں ہر حجم کے گول مٹول پتھر پڑے تھے۔ میرا منصوبہ یہ تھا کہ گاؤں کی دو بیل گاڑیوں میں سے ایک کا پہیہ نکالوں اور نالے کی تہہ میں گڑھا کھود کر اندر چھپ جاؤں اور یہ پہیہ میرے اوپر رکھ کر بڑے پتھروں کی مدد سے جما دیا جائے۔ چھوٹے پتھروں اور خشک پتوں وغیرہ کی مدد سے یہ پورا پہیہ چھپا دیا جاتا۔ اس کے علاوہ میں انسانی پتلا بنا کر راستے کے سامنے کہیں رکھ دیتا۔ پتلے والی سمت پہیہ تھوڑا سا بلند ہوتا تاکہ پتلا دکھائی دیتا رہے اور اس پر گولی چلا سکوں۔

یہ میرا منصوبہ تھا۔ جو افراد ہندوستان سے واقف نہیں، ان کی معلومات کے لیے بتاتا چلوں کہ یہاں بیل گاڑی کے پہیے بڑے اور پانچ فٹ قطر کے ہوتے ہیں۔ پوری گولائی میں چند انچوں کے فاصلے پر تین تین انچ موٹی بارہ لکڑیاں لگی ہوتی ہیں اور چھ انچ چوڑی اور تین انچ موٹی بیرونی گولائی پر فولادی پتری چڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کے وسط میں ڈیڑھ انچ موٹی لوہے کی سلاخ کے لیے سوراخ ہوتا ہے جو ایکسل کا کام کرتی ہے۔ پہیے کی بیرونی جانب ایکسل کو روکنے کے لیے لوہے کی موٹی سلاخ اس کے پار لگائی جاتی ہے۔ اندرونی جانب پہیے کو پھسلنے سے روکنے کے لیے لوہے کی سلاخ سوراخ کے باہر اچانک موٹی ہو جاتی ہے۔ زیادہ آرام دہ گاڑیوں میں ایکسل کے لیے سوراخ کی اندرونی جانب لوہے کی پتری لگی ہوتی ہے۔ ہر دو ہفتے بعد اس کو چکنا رکھنے کی خاطر پرانا موٹر آئل لگا دیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے بیرونی سلاخ نکال کر پہیہ الگ کیا جاتا ہے۔ تیل کا ڈبہ ہمیشہ بیل گاڑی کے نچلے حصے سے لٹکا رہتا ہے اور بوقتِ ضرورت پاس پڑی ہوئی کوئی بھی لکڑی یا ٹہنی استعمال کی جا سکتی ہے۔

چونکہ اس روز دیر ہو چکی تھی، سو ہم نے پہیے کا خیال بھلا کر گاؤں والوں سے پرانے کپڑے جمع کرنا شروع کر دیے۔ ان علاقوں میں پتلون نہیں ملتی، سو میں نے اپنی ایک پتلون قربان کی جس میں بانس اور بھوسہ بھر کر ہم نے دو 'ٹانگیں' بنائیں۔ چونکہ شیر کو پتلون اجنبی لگتی، ہم نے اس کے اوپر دھوتی لپیٹ دی۔ دھڑ کے لیے ہم نے پرانی بوری میں بھوسہ بھرا اور اوپر دو پھٹی پرانی قمیضیں اور ایک لیرا لیرا کوٹ اوپر ڈال دیا۔ سر کو بنانے کے لیے کافی مہارت درکار تھی سو ہم نے بڑے حجم کا ناریل اٹھایا جس کے الجھے ہوئے ریشوں نے بالوں کا کام کیا۔

تہواروں وغیرہ پر ہندوستانی خواتین پراندے لگاتی ہیں جو مصنوعی بال ہوتے ہیں اور ان سے جُوڑا یا مینڈھیاں بناتی ہیں۔ پھر اس میں یاسمین یا چمبیلی کے پھول لگاتی ہیں۔ خوش قسمتی سے ایک پرانا پراندہ ہمیں مل گیا۔ اس کو کنگھا کر کے ہم نے پتلے کے سر پر جما دیا۔ پھر ایک پھٹی پرانی پگڑی ہم نے ناریل پر باندھی اور پیروں کی جگہ سلیپر رکھ باندھ دیے۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، شیروں میں سونگھنے کی حس بالکل نہیں ہوتی، اس لیے یہ پتلا شیر کے لیے کافی حقیقی دکھائی دیتا۔ تاہم اگر وہ کچھ دیر گھورتا رہتا تو شاید پتلے کے ساکت ہونے پر اسے شبہ ہو جاتا۔

رات کو میں نے زخموں پر تازہ مرہم لگا کر اگلی صبح پھر پینسلین کا ٹیکہ لگایا۔ شکر ہے کہ زخم بھرنے لگ گئے تھے۔

صبح آٹھ بجے پانچ چھ دیہاتیوں کے ساتھ مل کر ہم نے بیل گاڑی کا پہیہ مطلوبہ جگہ منتقل کر دیا۔ یہاں ہم نے چار فٹ چوڑا اور چار فٹ گہرا گڑھا کھودا۔ کام آسان تھا کہ ندی کی ریت بہت نرم

تھی۔ پھر کچھ گھاس کاٹ کر تہہ میں بچھا دی گئی تاکہ نمی جذب ہو کیونکہ ندی کی تہہ جتنا کھودتے جائیں، نمی بڑھتی جاتی ہے۔

اندر بیٹھا تو پتہ چلا کہ میں نیم دراز حالت میں ہی رہ سکتا ہوں جو کافی بے آرام ہوتی ہے۔ تاہم بیٹھے رہنے سے کافی بہتر تھی۔

پتلے کو ہم نے املی کے درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر بٹھا دیا جو پندرہ فٹ دور نالے کے مغربی کنارے پر تھا۔ سو شیر چاہے جس سمت سے بھی آتا، فوراً پتلے کو دیکھ لیتا۔ آخر میں جتنی دیر میرے ساتھی بڑے پتھر جمع کرتے، میں رائفل لیے نگران رہا اور پھر پہیے کو چھپانے کے لیے جھاڑ جھنکار بھی جمع کیا گیا۔

آخرکار جب میں اس گڑھے میں بیٹھا تو پہیہ میرے سر سے محض دو انچ اوپر تھا۔ زمین اور پہیے کے درمیان پتلے کی سمت چھ انچ کا وقفہ تھا جہاں دو پتھر رکھ کر اتنی جگہ پیدا کی گئی تھی کہ میں رائفل نکال کر گولی چلا سکتا۔ پہیے کے اوپر بھاری پتھر رکھ کر اسے مضبوطی سے اس جگہ جما دیا گیا اور درمیان میں جگہ خالی تھی تاکہ ہوا کی آمد و رفت رہ سکے۔ پھر اس پہیے اور پتھروں اور آس پاس کافی جھاڑ جھنکار پھیلا دیا گیا تاکہ ایک تو شیر کو پتھروں کا ڈھیر دیکھ کر شبہ نہ ہو اور دوسرا یہ بھی کہ اگر شیر پیچھے سے آئے تو مجھے اس کے چلنے کی آواز آ جائے۔

حفاظت کے خیال سے میں نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ یہ سب لوگ ایک ساتھ واپس جائیں گے اور اگلے روز صبح کو ایک ساتھ واپس آئیں گے۔ میں ساری رات یہاں ایک طرح سے قید رہتا کہ اوپر رکھے پتھر اتنے بھاری تھے کہ انہیں ہلانا ممکن نہیں تھا۔

ساڑھے چار بجے میں اپنے گڑھے میں داخل ہوا اور میرے ساتھیوں نے نصف گھنٹے میں پتھر وغیرہ سب چھپا دیے۔ پانچ بجے کے قریب میں تنہا رہ گیا۔ گڑھے کے اندر بہت گرمی تھی۔ میں نے اپنا کوٹ اور قمیض اتار دی اور باقی کپڑے بھی اتار دیتا مگر زخم کے خیال سے نہیں اتارے۔

سامنے والے سوراخ سے مجھے پتلا اور اس کے آس پاس کا کافی حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ پتلے کے پیچھے مہندی کی کچھ جھاڑیاں بھی اگی ہوئی تھیں۔ اچانک اس سمت مجھے حرکت محسوس ہوئی اور غور کیا تو پتہ چلا کہ یہ حرکت نر چیتل کے کان ہلانے کی تھی جو اس پتلے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ جنگل میں بے حس و حرکت بیٹھنے کی اہمیت مجھ پر واضح ہو گئی۔ نر چیتل دس منٹ تک پتلے کو دیکھتا رہا۔ پھر اس کی دلچسپی ختم ہو گئی اور راستے پر نکل آیا اور اسے عبور کر کے دوسری جانب جنگل میں غائب ہو گیا۔ چیتل اور پتلے کا درمیانی فاصلہ بمشکل بیس فٹ ہو گا مگر چیتل کو اس سے کوئی خطرہ نہ لاحق ہوا۔ اگر کوئی انسان بیٹھا ہوتا تو وہ کوئی حرکت ضرور کرتا اور پلک جھپکانے کی حرکت بھی چیتل کو بھگا دیتی۔

پھر موروں کا جوڑا آیا۔ نر نے رک کر اپنی دم پھیلائی۔ مادہ اسے دیکھنے کے علاوہ اِدھر اُدھر بھی دیکھتی رہی۔ مگر جونہی اس نے پتلا دیکھا، بھاگ کر اڑ گئی۔ نر نے مایوسی سے دم جھکائی اور پر پھڑ پھڑاتا ہوا بھاگتے ہوئے اڑا۔

ہر سمت سے جنگلی مرغوں کی آوازیں آنے لگیں جو اندھیرا چھانے سے قبل اپنا پیٹ بھرنے نکلے تھے۔ پھر دیگر پرندوں کی آوازیں بھی آئیں۔ مختلف نر ماداؤں پر ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ اگرچہ مادہ ان پر توجہ نہیں دے رہی تھی مگر مادہ کی دلچسپی کے حصول کے لیے وہ اپنی جان جوکھوں میں ڈال رہے تھے۔

تاریکی چھانے لگی اور پھر موروں کے جوڑے نے رخصتی کی آواز نکالی کہ وہ اب جنگل میں اونچے درخت پر شاید چوتھائی میل دور بیٹھے تھے۔ سورج مغربی پہاڑیوں کے پیچھے غروب ہو گیا۔

جو قارئین ہندوستانی جنگلوں سے واقف ہیں، جانتے ہیں کہ کتنی تیزی سے دن کی جگہ رات شروع ہو جاتی ہے اور دن کے پرندے چپ ہو جاتے ہیں اور شبینہ پرندے ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ شبینہ پرندوں کی آوازیں آنے لگیں جو اپنے بڑے پر پھڑ پھڑاتے ہوئے حشرات کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے تھے اور کچھ ریت پر پتھروں کی طرح بیٹھ گئے۔

جہاں میں بیٹھا تھا، وہاں گہری تاریکی چھا چکی تھی اور پتلا بھی درخت کی چھاؤں میں چھپ گیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ چاندنی یہاں دس بجے کے بعد ہی پہنچے گی۔ نو بجے مجھے ندی کی تہہ میں اپنی جانب آتی ہوئی آوازوں سے پتہ چلا کہ کالا ریچھ آ رہا ہے۔ شیر کی آمد جاننے کے لیے ہم نے جو جھاڑ جھنکار جمع کیا تھا، ریچھ تقریباً اس پر پہنچ گیا۔ پھر اس کی نگاہ پتھروں اور بیل گاڑی کے پہیے پر پڑی۔ مجھے بخوبی اندازہ تھا کہ اس کے ننھے سے دماغ کے اندر اس وقت کیا سوچیں پیدا ہو رہی ہوں گی۔ 'اہاں، موٹے موٹے کیڑے، شاید دیمک بھی مل جائے، کیا پتہ چھوٹی مکھیوں والا شہد کا چھتہ ہو جن کے ڈنک مجھ جیسے بڑے ریچھ کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔'

انہی سوچوں کے ساتھ ہی ریچھ نے پتھر اور جھاڑیاں ہٹانی شروع کر دیں۔

میں نے سرگوشی کی، 'شش، دفع ہو۔'

ریچھ نے میری آواز سنی تو رک گیا۔ شاید وہ سوچ رہا ہو کہ یہ آواز کہاں سے آئی؟ چند منٹ خاموشی کے بعد اس نے پھر کام شروع کر دیا۔ میں نے پھر سرگوشی میں اسے دفع ہونے کا کہا۔ ریچھ پہیے پر چڑھا اور سیدھا مجھے گھورنے لگا۔

ریچھ کی غراہٹ کے جواب میں میں نے اسے بھاگنے کا کہا۔ بیچارہ ریچھ حواس باختہ ہو کر بھاگ نکلا اور راستے میں موجود رکاوٹوں سے ٹکراتا ہوا کنارے پر چڑھا اور بانس کے جھنڈوں سے ہوتا ہوا نکل گیا۔

ریچھ کو گئے دس منٹ ہوئے ہوں گے کہ مجھے انتہائی مدھم آوازیں آنے لگیں جیسے نرم گدیوں والا بھاری جانور چل رہا ہو۔ اس آواز کو لکھنا ممکن نہیں۔ یوں سمجھیں جیسے تکیہ بستر پر پھینکیں تو اس سے ملتی جلتی آواز۔

شیر پہنچ گیا تھا اور اب میرے عقب میں پڑے جھاڑ جھنکار کو احتیاط سے عبور کر رہا تھا۔

کیا وہ پتلے پر حملہ کرے گا؟ کیا وہ میرے سامنے سے گزرے گا؟ منتظر حالت میں یہ سوال میرے ذہن میں ابھرے۔ میرے اعصاب تناؤ کا شکار ہو رہے تھے۔

چاند نکل آیا تھا مگر اس کی روشنی ابھی درخت کے نیچے نہیں پہنچی تھی۔ پتلا مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر مجھے علم تھا کہ شیر اسے بخوبی دیکھ لے گا۔

پتہ نہیں کتنی دیر خاموشی رہی۔ پھر مجھے عین اپنے سر کے اوپر پتھر سرکنے کی آواز آئی۔ اس سمت سے حملے کا کسی کو اندازہ تک نہ تھا۔ مگر پہلے ریچھ بھی اس انہونی کی طرف متوجہ کر چکا تھا اور اب شیر بھی پہنچ گیا تھا۔ بھلا شیر نے پتلے کو نظر انداز کر کے عین اس جگہ کا رخ کیوں کیا جہاں میں چھپا ہوا تھا؟ عین ممکن تھا کہ ریچھ شیر کو دیکھ رہا ہو اور اس طرح اس کے فرار ہونے سے اسے شبہ ہوا ہو اور وہ تحقیق کرنے آن پہنچا ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ شیر کی پتلے کی سمت آمد کے راستے میں ہی میں موجود ہوں؟ وجہ چاہے جو بھی ہو، شیر اب مجھ سے محض دو گز دور اور میرے اوپر تھا۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اپنے اوپر مجھے شیر کے سانس لینے کی آواز آئی۔ پہیے پر رکھے ایک بڑے پتھر پر شیر کھڑا ہو کر مجھے گھورنے لگا۔

میں نے بھی وقت ضائع نہیں کیا اور اس دوران کروٹ لے کر شیر کی طرف رخ کر لیا۔ میں نے اپنی رائفل کو بھی گھمایا مگر اس کا کندہ پیندے سے ٹِک گیا۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ گڑھا چار فٹ گہرا اور چار فٹ چوڑا تھا۔ سو رائفل کو سیدھا کھڑا کرنا ممکن نہیں تھا۔ خیر رائفل کو میں محض ساٹھ درجے کے زاویے پر کھڑا کر سکا۔ بد قسمتی سے شیر دوسری سمت تھا۔

پھر واقعات تیزی سے رونما ہونے لگے۔ ریچھ کی نسبت شیر کا رویہ یکسر مختلف تھا۔ اس کے خدوخال مجھے دھندلے دکھائی دے رہے تھے۔ پھر وہ دھاڑا اور مسلسل غراتے ہوئے اس نے پہیے پر جست لگائی اور اندر پنجہ گھسا کر مجھے پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔

مجھے علم تھا کہ اگر اس کا پنجہ مجھے چھو گیا تو میری دھجیاں بکھیر دے گا۔ ہر ممکن کوشش سے گڑھے کی تہہ کے قریب رہتے ہوئے میں نے رائفل کا رخ موڑنے کی کوشش جاری رکھی۔

ان سارے واقعات کو چند لمحے لگے۔ شیر مزید قریب ہو کر دھاڑ رہا تھا کہ میری رائفل اس کے شانے سے مس ہوئی اور میں نے گولی چلا دی۔

اس محدود جگہ پر ہونے والے دھماکے کی آواز شدید محسوس ہوئی۔ شیر دھاڑتے ہوئے گولی کے دھکے سے اچھل کر پیچھے گرا۔ اگلے چند لمحے وہ پتھر، پہیے اور ریت کو چبانے کی کوشش کرتا رہا اور تکلیف سے دھاڑتا رہا۔ پھر میں نے اسے نیچے گرتے سنا اور پھر اٹھا، پھر گرا اور پھر اٹھ کر ندی کے کنارے جھاڑیوں میں گم ہو گیا۔ اس کے دھاڑنے کی آواز کم از کم پندرہ منٹ تک آتی رہی۔

پھر جنگل مکمل خاموش ہو گیا۔ چند منٹ قبل کے شور شرابے سے جنگل کی تمام تر مخلوقات بشمول حشرات نے خاموش ہو کر چھپنے کو ترجیح دی۔

گھنٹے گزرتے رہے۔ ایک بجے پہاڑیوں سے ہوا چلنا شروع ہو گئی اور آسمان پر تاریک بادل چھانے لگے اور چاند کو پوری طرح چھپا لیا اور پھر مغربی پہاڑوں پر بارش کی آواز آنے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد یہاں بھی موٹے موٹے قطرے گرنے لگے اور پھر موسلادھار بارش شروع ہو گئی۔ استوائی علاقوں کے باشندے جانتے ہیں کہ یہ بارش کتنی تیز ہوتی ہے۔ میں پوری طرح بھیگ گیا اور ساتھ ہی گڑھے میں پانی آنے لگا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ یہ ندی جو ابھی تک خشک تھی، کچھ دیر میں برساتی پانی سے بھر جائے گی۔ میں کسی چوہے کی طرح ڈوب جاؤں گا۔

اس حقیقت کے آشکار ہوتے ہی میں نے فوراً گھٹنوں کے جھک کر اپنی کمر کا زور لگا کر پہیہ ہٹانا چاہا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ میرے ساتھیوں نے میرے تحفظ کی خاطر بہت وزنی پتھر جما دیے تھے جنہیں ہٹانا میرے بس میں نہیں تھا۔

اب ایک صورت باقی بچی تھی کہ میں گولی چلانے کی نیت سے چھوڑے جانے والے چھ انچ کے سوراخ کو کھود کر بڑا کروں۔ دیوانہ وار میں نے دونوں ہاتھوں سے ریت کھودنا شروع کر دی۔ اس دوران گڑھا پانی اور ریت سے نصف بھر چکا تھا اور بھر بھرے کنارے ٹوٹ رہے تھے۔ صاف لگ رہا تھا کہ اگر میں چند منٹ میں باہر نہ نکل سکا تو پہیہ اور پتھر، سبھی مجھ پر آن گریں گے۔

جب باہر نکلنے کے لیے مناسب سوراخ ہو گیا تو میں نے اپنی رائفل کو پہیے سے باہر نکال کر رکھ دیا اور پھر پھنس پھنسا کر اس سوراخ سے نکلا۔ بارش مسلسل جاری تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ شیر کتنی دیر قبل اور کس سمت کو گیا تھا۔ سو رائفل اٹھا کر میں نے پتلے کو اٹھایا اور مغربی کنارے پر

رکھ دیا۔ پھر کمپی کاری جانے کے لیے میں نے نہر عبور کرنا شروع کی تو مجھے دور پہاڑوں سے برساتی پانی کا ریلا آنے کا شور سنائی دیا۔

چند منٹ میں ریلا پہنچ گیا۔ تین فٹ اونچی جھاگ بھرے پانی کی دیوار تھی جو اپنے ساتھ بہت کچھ لا رہی تھی۔ درختوں کے تنے، اکھڑے ہوئے درخت، خشک بانس اور ہر قسم کا جھاڑ جھنکار اس میں تھا۔ یہ سب کچھ گاڑی کے پہیے تک پہنچا اور سب کچھ اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔ پانچ منٹ سے بھی کم وقت میں یہ ندی چار فٹ گہرا بپھرا ہوا دریا بن چکی تھی۔

اپنے بحفاظت فرار پر شکر ادا کرتے ہوئے میں نے کمپی کاری کا رخ کیا۔ بارش کے شور سے کچھ اور نہ سنائی دیا۔ تاریکی بہت گہری تھی اور ٹارچ کی روشنی محدود دائرے میں کام کر رہی تھی۔ نرم ربر کے جوتوں کے نیچے گیلی زمین انتہائی پھسلوان بن گئی تھی۔ راستے میں مجھے تین اور ندیاں عبور کرنا پڑیں جو میری نشست والی ندی سے کچھ چھوٹی تھیں مگر ان میں بھی سیلاب سا آیا ہوا تھا۔

کمپی کاری کے نصف راستے پر مجھے قریب آتی ہوئی روشنی دکھائی دی۔ کچھ دیر بعد مجھے بیرا، رنگا اور کچھ دیہاتی لالٹین اٹھائے آتے دکھائی دیے۔ مجھے لاحق خطرے کے بارے انہیں بروقت احساس ہو گیا تھا اور وہ آدم خور کے خطرے سے قطع نظر، میری مدد کو آ رہے تھے۔

اگلی صبح سورج خوب چمک رہا تھا۔ ہم اس گڑھے کو واپس لوٹے جہاں میں بیٹھا تھا۔ سبھی ندیوں میں اب مٹیالا پانی بہہ رہا تھا مگر اس کی گہرائی دو فٹ رہ گئی تھی۔ گڑھے کے مقام پر کہیں بھی بیل گاڑی کا پہیہ نہیں دکھائی دیا۔ شاید سیلابی پانی اسے اپنے ساتھ بہت دور تک بہا کر لے گیا ہو گا اور پہیہ ٹوٹ پھوٹ گیا ہو گا۔ ہم نے دونوں کناروں کی اچھی طرح تلاشی لی مگر شیر کا کوئی نشان نہ ملا۔ بارش نے شیر کے خون اور دیگر علامات کو خوب مٹا دیا تھا۔

دو گھنٹے بعد مایوس اور تھکے ہارے ہم کمپی کاری لوٹے۔ تین دن مزید رک کر میں نے شیر کے بارے خبر کا انتظار کیا مگر مایوسی ہوئی۔ بیرا اور رنگا کا یہی خیال تھا کہ شیر زخموں کی تاب نہ لا کر مر گیا ہوگا۔ مگر مجھے یقین نہیں تھا کہ ان حالات میں چلائی گئی گولی سے شیر کو مہلک زخم لگا ہوگا۔

اس جانور کے شکار کے لیے لی گئی چھٹی ختم ہو گئی، سو میں کمپی کاری سے چوتھے روز نکلا اور بیرا اور رنگا کو ہدایت کی کہ وہ مسلسل صورتحال کا جائزہ لیتے رہیں۔ اگر کوئی نئی اطلاع ملتی تو پِنا گرام سے دھرماپوری جا کر مجھے تار بھیج کر میرے جواب کا وہیں انتظار کرتے۔

بنگلور واپسی کے دسویں روز مجھے مطلوبہ تار ملا کہ کوڈی کاری کے فارسٹ گارڈ کا ایک مال بردار گدھا مارا گیا ہے۔ واردات کے وقت کا اندازہ لگایا تو میرے پہنچنے تک کل چار روز گزر چکے ہوتے۔ سو میں نے انہیں جوابی تار بھیجا کہ وہ کمپی کاری لوٹ کر مجھے حالات سے آگاہ رکھیں۔

چھ دن بعد مجھے دوسرا تار ملا کہ شیر نے دریائے چنار پر سوپاٹھی کو جانے والے راستے پر بیل گاڑیوں کے قافلے کے آخری گاڑی بان پر حملہ کیا ہے۔ یہ قافلہ مراپور کی بستی سے روانہ ہوا تھا۔

بلاشبہ یہ آدم خور کی واردات تھی۔ ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں میں بذریعہ کار روانہ ہو گیا تھا۔ راستے میں بیرا اور رنگا کو لینے کے بعد ہم ایک ساتھ پِنا گرام کو روانہ ہوئے جہاں کار کھڑی کر کے ہم بارہ میل کے پیدل سفر پر مراپور روانہ ہو گئے۔ راستے میں ہم نے دریائے چنار بھی عبور کیا۔

راستے میں پتہ چلا کہ گاڑی بان حملے میں بچ گیا تھا کہ اس نے حملہ ہوتے ہی گاڑی سے باہر چھلانگ لگا دی تھی اور دونوں بیلوں کے درمیان کاٹھی کے نیچے چھپ گیا تھا۔ اس نے خوب شور مچانا شروع کیا اور اس کے ساتھیوں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ شیر ڈر کر فرار ہو گیا۔

میں نے گاڑی بان سے موراپور میں بات کی۔ اس نے بتایا کہ شیر اچانک اس کی گاڑی کے پیچھے نمودار ہوا کہ اس کی گاڑی آخر میں تھی اور جست لگا کر گاڑی پر سوار ہونے کی کوشش کی تو گاڑی بان نے جست لگا کر بیلوں کے درمیان پناہ لے لی۔ جب میں نے پوچھا کہ شیر کو گاڑی پر چڑھنے میں کیا دقت رہی ہوگی تو وہ بولا کہ شیر ابھی آدھا سوار ہوا تھا کہ اس نے چھلانگ لگا دی تھی۔

اسی دوران سوپاٹھی سے ہمارے بعد آنے والے مسافروں نے بتایا کہ انہیں شیر کے گزشتہ رات والے پگ دریائے چنار کو جاتے دکھائی دیے تھے۔

یہ سنتے ہی ہم سوپاٹھی کو لوٹے اور فوراً ہی پگ تلاش کر لیے۔ دریائے چنار میں پانی کا بہاؤ چمک رہا تھا۔ یہاں نرم اور نم ریت پر ہمیں آدم خور کے پگ واضح دکھائی دیے۔ جسم کا زیادہ تر بوجھ اگلے بائیں پیر پر تھا اور ہر قدم پر دائیں پنجے کا معمولی سا نشان دکھائی دیتا تھا۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ اس جگہ مکڑیوں کی وادی دریائے چنار سے ملتی ہے۔ نصف میل نیچے کی جانب جہاں شیر گیا تھا، وہاں دریا کے وسط میں چھوٹی اور لمبی چٹان تھی۔ اس کی اونچائی چار فٹ تھی اور دریا کے وسط میں موجود اس کی لمبائی چالیس فٹ اور چوڑائی آٹھ فٹ تھی۔ میں نے رات کو اس چٹان پر بسر کرنے کا فیصلہ کیا کہ اگر شیر دریا سے واپس ہوتا تو اونچائی سے آسانی سے دکھائی دے جاتا۔

رنگا کی پرانی پگڑی، دھوتی اور بھوری صدری مانگ کر میں نے تینوں اپنے کپڑوں کے اوپر پہن لیں اور ساڑھے پانچ بجے اس چٹان پر بیٹھ گیا۔ رنگا اور بیرا اکیلے مراپور جانے سے گھبرا رہے تھے، سو انھوں نے دریائے چنار کے پاس ہی اونچے درختوں کے دوشاخوں پر بیٹھنے کا فیصلہ کیا۔

رات کافی تاریک ہوتی مگر اونچی چٹان پر بیٹھ کر مجھے دریا کی سفید ریت پر تاروں کی روشنی میں آتا شیر دور سے دکھائی دے جاتا۔ اس جگہ دریا سو گز چوڑا تھا۔ مجھے علم تھا کہ شیر معذور بھی ہو چکا ہے اور ویسے بھی شیر پچاس گز سے زیادہ دور سے حملہ نہیں کرتا بلکہ ہر ممکن طور پر قریب پہنچ کر حملہ کرتا ہے۔

ٹارچ کا بغور معائنہ کرکے میں نے اپنی اعشاریہ ۴۰۵ بور کی رائفل بھر کر اپنے دائیں جانب رکھ لی جہاں شیر کو دکھائی نہ دیتی۔ اس کے علاوہ میں اضافی ہتھیار کے طور پر اپنی بارہ بور کی دو نالی جیفریز بھی لایا تھا۔ اس کی تنگ نالی میں گراپ اور عام نالی میں گولی کا کارتوس تھا۔ بندوق کو میں نے بائیں جانب رکھا۔ چائے کی تھرموس، چند روٹیاں اور پائپ کی موجودگی میں صبح تک مجھے ہر طرح سے آرام تھا۔ میں اپنے کوٹ کے اوپر بیٹھ گیا کہ اس طرح پتھر بھی نہ چبھتا اور رات کو سردی ہوتی تو کوٹ پہن بھی لیتا۔

معمول کے مطابق پرندوں اور جانوروں نے آوازیں نکال کر دن کو رخصت کیا اور رات کے باسیوں نے اپنی آوازیں سنانا شروع کر دیں۔

ساڑھے سات تک تاریکی چھا چکی تھی اور دریائے چنار کی سفید ریت چاروں طرف بکھری ہوئی تھی۔

نو بجے کے بعد کنارے سے ایک ہاتھی شور مچاتا اترا اور ریت پر چلنے لگا اور میری چٹان کے پاس سے گزر گیا۔ تھوڑا آگے جا کر اسے ہوا کے جھونکے نے میرے بارے خبردار کیا۔ اپنی سونڈ کو موڑ کر اس نے زمین پر مارا اور پھر مڑا تو میری زیادہ بو آئی۔ پھر وہ کنارے پر چڑھ کر جھاڑیوں میں گم ہو گیا۔ عام ہاتھی کا رویہ ایسا ہی ہوتا ہے۔

سورج غروب ہونے کے بعد سے گیارہ بجے تک بھی میں مسلسل چاروں طرف نگران تھا۔ اچانک مجھے آنکھوں کے گوشے سے پیچھے بائیں جانب کچھ حرکت سی محسوس ہوئی۔ اس جانب دیکھا تو کچھ دکھائی نہ دیا۔ ارے، وہاں کوئی بھورا سا دھبہ تھا جو سفید ریت پر دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے منہ دوسری طرف موڑ کر پھر واپس اس جانب دیکھا تو وہ دھبہ غائب ہو چکا تھا۔

میں نے سوچا: 'عجیب بات ہے۔ کیا میری آنکھیں درست کام نہیں کر رہیں یا تھکن کا نتیجہ ہے؟'

اس جانب غور سے دیکھنے پر مجھے دھبہ پھر دکھائی دیا، مگر اس مرتبہ وہ مجھ سے زیادہ قریب آ چکا تھا اور اب کنارے اور چٹان کے وسط تک پہنچ گیا تھا۔

اب میں کسی اور جانب دیکھنے کا خطرہ نہیں مول لے سکتا تھا کہ اس دھبے کی اہمیت زیادہ تھی۔ پھر میں نے اسے پھیل کر اپنی جانب تیرتے دیکھا۔ یہ دھبہ پھیلتے اور سکڑتے ہوئے میری جانب بڑھتا رہا مگر کوئی آواز نہ پیدا ہوئی۔

اچانک مجھ پر انکشاف ہوا کہ یہ کیا ہے۔ یہ شیر تھا جو اپنے پیٹ کے بل جھک کر خاموشی سے میری جانب آ رہا تھا تاکہ اتنے قریب پہنچ جائے کہ حملہ کر سکے۔ میرے چہرے اور گردن سے پسینہ بہنے لگا۔ میں دہشت اور جوش سے کانپنے لگا۔ تاہم اس سے فائدہ نہیں ملنا تھا، سو میں نے گہرا سانس لے کر روک لیا۔ اس طرح میرے اعصاب قابو میں آ گئے۔ میں نے خدا سے دعا مانگی اور اپنی گود سے رائفل اٹھا کر شانے سے لگائی۔

شیر اب بھی بیس گز دور ہوگا، مگر اس نے میری حرکت دیکھی تو اسے علم ہو گیا کہ اس کی موجودگی کا راز فاش ہو گیا ہے۔ اس کے پیچھے کالے رنگ کی لکیر ہلی جو اس کی دم تھی۔ دھبہ ایک دم مختصر

ہوا تاکہ حملہ کر سکے۔ میری ٹارچ کی روشنی سیدھی اس کے کھلے منہ پر پڑی۔ اس کی جست سے ایک ثانیہ قبل میری رائفل بول پڑی۔

میری گولی چلتے ہی وہ اٹھا اور آگے کو جست لگائی۔ شکر ہے کہ میری ٹارچ نہیں بجھی اور میں دوسری گولی چلا سکا۔ اس دوران شیر چٹان تک پہنچ گیا تھا۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ پچھلے زخم یا شاید اب کی پہلی گولی کی وجہ سے وہ چٹان پر نہ چڑھ سکا۔ میری تیسری گولی اس کی کھوپڑی پر لگی اور اس کا حملہ وہیں رکا اور شیر نیچے ریت پر گر گیا۔

سیٹی بجاتے ہوئے سو پا ٹھی کے راستے پر میں نے رنگا اور بیرا کو ان کے درختوں سے اتارا۔ میری گولیوں کی آوازیں سن کر اور مجھے آتا دیکھ کر وہ سمجھ گئے تھے کہ میں نے آدم خور کو ہلاک کر لیا ہے۔

اگلی صبح ہم نے جا کر دیکھا تو پتہ چلا کہ شیر اوسط جسامت کا اور نسبتاً کمزور نر شیر تھا۔ سترہ روز قبل گڑھے میں سے چلائی ہوئی گولی نے میری توقع سے زیادہ نقصان پہنچایا تھا۔ گولی اس کے دائیں شانے سے ہوتی ہوئی اور ہڈی توڑتے ہوئے باہر نکل گئی تھی۔ تاہم زخم اچھی حالت میں تھا اور مجھے یقین ہے کہ وقت کے ساتھ بھر بھی جاتا، مگر شیر لنگڑاتا ضرور۔ گزشتہ رات کی پہلی گولی اس کے کھلے منہ سے گزری اور گردن سے نکل گئی اور شیر کو روک نہ سکی۔ دوسری گولی کافی اونچی گئی تھی اور اس کے بائیں کندھے کے پیچھے داخل ہوئی اور پھیپھڑوں سے گزرتی ہوئی باہر نکل گئی۔ پھر بھی شیر نہ رکا۔ میری آخری گولی جو اس کی کھوپڑی میں پیوست ہوئی، نے آدم خور کے حملے کو روک دیا۔

شیر آدم خوری پر کیوں مائل ہوا؟ ہر شکاری یہ راز جاننے کی کوشش کرتا ہے، چاہے اس کا شکار کوئی تیندوا ہو یا پھر شیر۔ اس سے نہ صرف اس کی اپنی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ عوام الناس کو بھی پتہ چلتا ہے۔ یہ شیر بھی انسانی قصور سے آدم خور بنا تھا۔ اس کی اگلی دائیں ٹانگ میں ایک پرانی گولی موجود تھی اور کہنی کے جوڑ میں پیوست ہو گئی تھی۔ یہ گولی نرم سیسے کی تھی جو پھیل گئی۔ شاید ایک سال یا زیادہ عرصہ قبل کسی شکاری نے توڑے دار بندوق سے اس کو شکار کرنے کی کوشش کی تھی۔

یہ رکاوٹ جو اس کے جسم کے اہم ترین جوڑ میں پیوست تھی، نے نہ صرف شیر کو بہت تکلیف پہنچائی بلکہ اس کی وجہ سے وہ اپنی عام خوراک کو شکار کرنے کے قابل نہ رہ گیا تھا۔ شیر کے شکار کرنے کے لیے سب سے اہم اس کا اگلا دائیں پنجہ ہوتا ہے۔ بلاشبہ اسی وجہ سے شیر عام جنگلی جانوروں اور مویشیوں پر حملے کے قابل نہ رہا اور فاقوں کی بجائے اس نے انسانوں کو شکار کرنا شروع کر دیا۔

۲ عالم بخش اور کالا ریچھ

یہ کہانی کالے ریچھ سے متعلق ہے، جو بہت بڑا اور بہت برا تھا۔

میں کئی دوسری کہانیوں میں بتا چکا ہوں کہ تمام ریچھ بدمزاج، ناقابلِ اعتبار اور غصیلے ہوتے ہیں۔ عموماً یہ انسانوں پر بغیر کسی وجہ کے محض اس لیے حملہ کر دیتے ہیں کہ ان کے سوتے ہوئے یا پیٹ بھرتے ہوئے یا ویسے ہی کوئی انسان کے قریب سے گزر رہا تھا۔ اس لیے مقامی قبائل ریچھوں سے کافی دور رہنا ہی مناسب سمجھتے ہیں۔ اسی طرح مقامی لوگ ہاتھیوں سے بھی فاصلہ رکھنا بہتر سمجھتے ہیں۔

یہ ریچھ دیگر کی نسبت انتہائی بدمزاج اور زیادہ کمینہ تھا۔ بہت دور سے بھی انسان کو دیکھ کر وہ ہر ممکن کوشش کر کے انسانوں پر حملہ کرتا۔

اس عجیب رویے کی توجیہ مشکل ہے۔ اس بارے کئی کہانیاں مشہور تھیں۔ ایک کے مطابق تو یہ ریچھ پاگل ہو چکا تھا۔ دوسری کہانی کے مطابق یہ ریچھ نہیں بلکہ ریچھنی تھی جس کے بچوں کو کسی انسان نے چرا لیا تو ریچھنی صدمے سے پاگل ہو گئی۔ میرا خیال ہے کہ اس ریچھ کو کسی انسان نے ماضی میں زخمی کیا ہوگا۔ ایک کہانی تو یہ بھی مشہور تھی کہ ایک سال قبل ایک نوجوان لڑکی کو ریچھ نے اغوا کر کے اپنی بیوی بنا لیا تھا۔ یہ لڑکی اس وقت پہاڑی پر بکریاں چرا رہی تھی جہاں ریچھ بھی ایک غار میں رہتا تھا۔ ریچھ اسے اپنی غار میں لے گیا۔ کہانی کے مطابق پھر دیہاتی اس لڑکی کو چھڑانے گئے اور ریچھ کے غصے کے باوجود اسے چھڑا کر لے آئے۔ اسی وجہ سے ریچھ نے انسانوں سے انتقام لینا شروع کر دیا۔

وجہ چاہے جو بھی رہی ہو، ریچھ کے متاثرین کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ اس ریچھ کے ہاتھوں کم از کم بارہ افراد ہلاک اور پچیس سے زیادہ مجروح ہوئے تھے۔

ہر ریچھ کی مانند اس کا پہلا وار ہمیشہ اپنے شکار کے چہرے پر ہوتا تھا جسے وہ اپنے لمبے اور طاقتور ناخنوں سے چیرنا اور ساتھ ساتھ چہرے کو چبانا بھی شروع کر دیتا۔ اس کے زخمی کردہ نصف افراد کی ایک یا دونوں آنکھیں ضائع ہو چکی تھیں۔ بعض کے ناک غائب تھے تو بعض کی رخساروں کی ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ جو افراد جاں بحق ہوئے، ان میں تقریباً سبھی کا چہرہ ان کے سر سے الگ ہو چکا ہوتا تھا۔ مقامی لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ یہ ریچھ آدم خور ہو چکا ہے کیونکہ اس کے شکار کردہ کم از کم تین انسانوں کی لاشیں جزوی کھائی جا چکی تھیں۔

چونکہ ان افواہوں کی تصدیق کرنے کا موقع مجھے نہیں ملا مگر شاید ان میں کچھ صداقت ہو سکتی ہے کہ ہندوستانی کالا ریچھ مردار بھی کھا لیتا ہے، تاہم عام حالات میں ریچھ سبزی خور ہوتا ہے اور جڑیں، پھل، شہد، دیمک اور اسی طرز کی دیگر چیزیں کھاتا ہے۔ مگر تازہ گوشت چاہے وہ حیوانی ہو یا انسانی، اس سے منہ نہیں موڑتا۔

یہ ریچھ پہلے ناگوارہ کی پہاڑیوں میں رہتا تھا جو ارسیکری کے بڑے قصبے کے مشرق میں ہے۔ یہ علاقہ ریاست میسور میں اور بنگلور سے ۱۰۵ میل اور شمال مغرب میں واقع ہے۔

انہی پہاڑیوں میں اس نے وارداتیں شروع کی تھیں۔ پھر جوں جوں انسان کا خوف اس کے دل سے نکلتا گیا، اس نے نیچے میدانی علاقوں تک اپنی سرگرمیوں کا دائرہ بڑھا دیا اور کھیتوں میں لوگوں کو طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب کے وقت ڈرانے پہنچ جاتا۔ وہ یہاں پائی جانے والی بے شمار چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں سے نکل کر پیٹ بھرنے کہیں بھی پہنچ جاتا۔

سال بھر سے میں اس ریچھ کے بارے اڑتی اڑتی خبریں سن رہا تھا مگر زیادہ توجہ اس لیے نہیں دی کہ ہندوستان میں جنگلی درندوں کے ہاتھوں زخمی ہونے کے بارے باتیں بڑھا چڑھا کر پیش کی جاتی ہیں۔ مزید یہ بھی کہ مجھے ریچھوں سے کافی دلچسپی ہے اور شاید اسی وجہ نظرانداز کر گیا۔ میں اس ریچھ کا پیچھا کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

مگر ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ مجھے مجبور ہونا پڑا۔ میرا ایک مسلمان دوست تھا جس کا نام عالم بخش تھا۔ عالم بخش ارسیکری اور شموگا کے درمیان واقع ایک مسلمان پیر کے مزار کا متولی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بزرگ پچاس سال قبل یہاں رہتے تھے۔ ہندوستان کے طول و عرض میں ایسے مزار بے شمار ملتے ہیں۔ مسلمان قوم انہیں بہت مقدس سمجھتی اور ان کا احترام کرتی ہے۔ ہر مزار کا اپنا ایک متولی ہوتا ہے جو عموماً کوئی بوڑھا آدمی ہوتا ہے جو خود ہی یہ ذمہ داری سنبھال لیتا ہے اور وہیں پاس ہی رہنا شروع کر دیتا ہے۔ متولی کی ذمہ داریوں میں عموماً روزانہ مزار پر چراغ جلانا ہوتا ہے جو ساری رات جلتا رہتا ہے۔ یہ علامت ہوتی ہے کہ اس پیر کی یاد اس کے مریدوں کے دل میں اسی طرح روشن رہتی ہے۔

پہلی بار عالم بخش سے میری ملاقات ایک تاریک رات میں بنگلور سے شموگا جاتے ہوئے ہوئی تھی۔ میں شیر کے شکار پر جا رہا تھا۔ اچانک گاڑی کا پچھلا پہیہ نکل گیا اور گاڑی زور سے سڑک سے ٹکرائی۔ اس وقت میں اکیلا سفر کر رہا تھا اور نیچے اتر کر میں نے مایوسی اور غصے سے گاڑی کا جائزہ لیا۔ خوش قسمتی سے یہ حادثہ اس مزار کے عین سامنے ہوا تھا اور شور سن کر عالم بخش اپنی جھگی سے باہر نکلا۔ میرا مسئلہ دیکھ کر اس نے مدد کرنے کے لیے لالٹین جلایا اور پھر گاڑی کے سامنے پتھر وغیرہ رکھ دیے تاکہ میں گاڑی کو اٹھا سکوں۔ پھر اس نے مجھے گرم چائے کا پیالہ بھی لا کر دیا۔ میں

نے پہیہ بدلا اور پھر اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر وعدہ کیا کہ جب بھی یہاں سے گزرا، اس سے لازماً ملاقات کروں گا۔ میں نے اس وعدے کو ہمیشہ نبھایا اور ہر بار اس کے لیے تحفے تحائف اور دیگر سامان لاتا رہا۔

مزار سے چار سو گز پیچھے چھوٹی سی پہاڑی ہے جس میں بڑے بڑے پتھر موجود ہیں اور یہاں خاردار جھاڑیاں اگی ہیں۔ اس مقام سے لے کر مزار تک، مون سون کے موسم میں دیہاتی مونگ پھلی بو دیتے ہیں۔ ہر ریچھ مونگ پھلیوں کا شیدائی ہوتا ہے اور یہ ریچھ بھی تھا۔ یہ پہاڑی ریچھ کی رہائش کے لیے بہترین مقام ہے اور ساتھ ہی مونگ پھلیاں بھی موجود ہیں۔ سور ریچھ نے یہاں رہنا شروع کر دیا۔

ریچھ کی رہائش ایک بڑے پتھر کے نیچے موجود غار میں تھی۔ سورج غروب ہوتے ہی وہ بھوک سے بے تاب ہو کر اس غار سے نکل آتا اور جوں جوں تاریکی گہری ہوتی، وہ مونگ پھلی کے کھیتوں کی جانب اترتا دکھائی دیتا۔ یہاں وہ ساری رات پیٹ بھرتا۔ علی الصبح وہ بھرے پیٹ کے ساتھ لوٹ جاتا۔ سکون سے سارا دن سو کر گزارتا۔ میں یہ کہنا بھول گیا تھا کہ پہاڑی کی دوسری جانب ایک قدرتی تالاب تھا۔ سور ریچھ کی تمام تر ضروریات آسانی سے پوری ہو رہی تھیں۔

اسی دوران مزار کے ساتھ سڑک پر موجود انجیر کے درختوں پر پھل پک گیا اور شاخیں پکے ہوئے انجیروں سے جھک گئیں۔ بہت سارے انجیر نیچے گر جاتے۔ سینکڑوں کی تعداد میں مختلف اقسام کے پرندے دن کے وقت اپنا پیٹ بھرنے آتے۔ رات کو ہندوستانی پھل والی چمگادڑیں پہنچ جاتیں اور شور مچاتے ہوئے اپنا پیٹ بھرتیں۔

یہ بے شمار پرندے اور جانور دن رات اپنا پیٹ بھرنے کے دوران بہت سارے انجیر گرا بھی دیتے، کچھ انجیر پک کر گرتے تو کچھ ہوا سے گرتے۔ ریچھ کو انجیر بھی بہت پسند ہوتے ہیں۔

اب کھیتوں سے نکل کر وہ انجیر کے درختوں تک آنا شروع ہو گیا جو مزار کے گرد و نواح میں تھے۔ یہاں سے مسئلہ شروع ہوا۔

عالم بخش کا بائیس سال کا ایک بیٹا تھا جو اس کی بیوی اور بہن کے ساتھ وہیں رہتا تھا۔ ایک رات کھانا کھانے کے بعد جب سب سونے لگے تو لڑکے کو کسی وجہ سے باہر جانا پڑا۔ رات تاریک تھی اور ریچھ پاس ہی انجیر کے درختوں کے نیچے پیٹ بھر رہا تھا۔ اچانک انسان کے ظہور سے ریچھ کو خطرہ محسوس ہوا ہو گا اور اس نے فوراً حملہ کر دیا۔ یہ حملہ حادثاتی تھا اور ریچھ نے چہرے کی بجائے گلے پر حملہ کیا۔ لڑکے نے چیخنے کی کوشش کی اور ریچھ کو لاتیں اور گھونسے مارے۔ ریچھ نے پھر حملہ کیا اور ایک آنکھ اور ناک نکال لے گیا اور اس کے سینے، کندھوں اور کمر پر پنجوں سے گہری خراشیں ڈالیں اور پھر اسے چھوڑ کر اندھیرے میں گم ہو گیا۔

خون میں لت پت لڑکا گھر واپس پہنچا۔ اس کی شہ رگ کٹ گئی تھی اور اگرچہ ان لوگوں نے پرانے کپڑوں سے خون روکنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔

صبحِ کاذب کے وقت لڑکے کی روح نکل گئی۔ انجیروں اور مونگ پھلیوں سے پیٹ بھر کر ریچھ واپس اپنی غار میں چلا گیا۔

عالم بخش بہت غریب تھا اور تار بھیجنے کے قابل نہ تھا اور نہ ہی اتنے پیسے تھے کہ بنگلور تک کا کرایہ بھرتا۔ تاہم اس نے پوسٹ کارڈ پر اپنی داستانِ غم پنسل سے اردو زبان میں لکھ کر بھیجی۔ خط پر

اس کے خشک آنسو موجود تھے۔ دو روز بعد مجھے یہ پوسٹ کارڈ ملا اور تین گھنٹے بعد میں ارسیکری روانہ ہو گیا۔

میرا خیال تھا کہ ریچھ کا شکار آسان کام ہوگا اور ایک یا دو گھنٹے بعد فارغ ہو جاؤں گا۔ اسی وجہ سے میں نے زیادہ تیاری نہیں کی تھی۔ میرے پاس ٹارچ، اعشاریہ ۴۰۵ بور کی ونچسٹر رائفل اور ایک جوڑا کپڑے تھے۔ شام پانچ بجے کے بعد میں عالم بخش سے ملا اور کہانی سننے پر زیادہ وقت نہیں لگا۔

راتیں تاریک تھیں۔ مگر میرا منصوبہ سادہ سا تھا کہ میں اندھیرا چھانے کے بعد باہر نکلتا اور ٹارچ کی روشنی میں ریچھ کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا۔

یہ سن کر عالم بخش مجھے اپنی جھگی کے اندر لے گیا اور دروازہ بند کر دیا۔ اس چھوٹے سے کمرے میں دیے کی روشنی میں اس نے مجھے کئی مرتبہ اپنے بیٹے کی موت کے واقعات سنائے۔ ہر چند منٹ بعد پورا خاندان رونے لگ جاتا۔ مجبوری کی حالت میں مجھے آٹھ بجے تک یہ سب برداشت کرنا پڑا۔ آٹھ بجے جب یہ برداشت سے باہر ہو گیا تو میں نے ریچھ کی تلاش میں باہر نکلنے کا فیصلہ کیا۔

رائفل بھر کر میں نے ٹارچ کا معائنہ کیا اور پھر باہر قدم رکھا۔ عالم بخش نے میرے پیچھے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ تاریکی بہت گہری تھی اور جونہی میں نے رائفل پر موجود ٹارچ کو جلایا تو اس کی طاقتور روشنی نے بائیں جانب مجھے مونگ پھلی کے کھیت دکھائے اور دائیں جانب سڑک کے کنارے انجیر کے درخت کھڑے تھے۔

چونکہ ریچھ کہیں دکھائی نہیں دیا، میں نے فیصلہ کیا کہ میں اسے تلاش کرتا ہوں اور یہ کام انجیر کے درختوں سے شروع کیا۔ درخت سڑک کے دونوں جانب تھے، سو میں نے سڑک پر چلنے کا

فیصلہ کیا اور ٹارچ دونوں جانب گھماتا جاتا۔ اس طرح میں ڈیڑھ میل ایک سمت میں چلا مگر ریچھ نہ دکھائی دیا۔ پھر میں مزار کی طرف لوٹا اور پھر دوسری جانب ڈیڑھ میل چلا۔ مگر ریچھ ندارد۔ پھر میں مزار کو لوٹا اور مونگ پھلی کے کھیتوں میں ریچھ کو تلاش کرنے لگا۔

ٹارچ کی روشنی میں بہت ساری چمکدار آنکھیں مجھے دیکھنے لگیں۔ تاہم یہ سب خرگوش اور تین چار گیدڑ تھے۔ میں نے پہاڑی کے گرد چکر کاٹا اور راستے میں کیچڑ میں لوٹتے ہوئے کچھ سور ڈر کر بھاگ اٹھے۔ تاہم ریچھ کا کوئی نشان نہ ملا۔ پھر میں پہاڑی کے قریب پہنچ کر اس کے گرد دو یا تین چکر لگائے اور ٹارچ کی روشنی اوپر اور اطراف میں پھینکتا رہا۔ میں کافی تھک گیا تھا مگر ریچھ کا کوئی اتہ پتہ نہیں تھا۔ تیسرے چکر پر میں ایک انتہائی زہریلے رسل وائپر پر پیر رکھتے رکھتے بچا۔ یہ سانپ عین میرے راستے میں دو پتھروں کے درمیان کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ چونکہ میں ریچھ کی تلاش پر توجہ دے رہا تھا، اس لیے راستے کو نظر انداز کر دیا تھا۔ میرا پیر اس کے منہ سے چند انچ کے فاصلے پر پڑا اور اس کی پھنکار سن کر میں خبردار ہوا۔ لاشعوری طور پر میں نے فوراً پیچھے کو چھلانگ لگائی اور سانپ پر روشنی ڈالی تو دیکھا اس کا وار عین اسی جگہ ہوا جہاں سے میں نے قدم ہٹایا تھا۔ میں بال بال بچا تھا اور ایک لمحے کو تو خیال آیا کہ سانپ کو گولی مار دوں۔ تاہم اس طرح اتنا شور ہوتا کہ ریچھ فرار ہو جاتا اور قیمتی کارتوس ضائع ہوتا۔ ویسے بھی سانپ نے حملہ کرنے سے قبل مجھے پھنکار کر خبردار تو کر ہی دیا تھا۔ سو میں نے اس پر چھوٹا پتھر پھینکا اور سانپ فرار ہو گیا۔

اس وقت تک یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ یا تو ریچھ شام ہوتے ہی اترا اور اب بہت دور پہنچ چکا ہوگا یا پھر ابھی تک اس کا پیٹ بھرا ہوگا اور غار میں سو رہا ہوگا۔ میں نے سوچا کہ عالم بخش کی جھگی کو جا کر دو گھنٹے بعد پھر چکر لگاؤں گا۔

میں نے ایسا ہی کیا اور ایسے دو مزید چکروں کے بعد بھی ریچھ کا کوئی نشان نہ ملا۔ صبحِ کاذب ہو گئی مگر ریچھ نہ دکھائی دیا۔

جب دن نکل آیا تو میں نے عالم بخش سے کہا کہ میں بنگلور جا رہا ہوں مگر اس نے درخواست کی کہ آج کا دن رک کر پہاڑی پر غاروں میں ریچھ کو تلاش کروں۔ اس دوران اس کی بیوی میرے لیے گرما گرم روٹیاں اور چائے بنا چکی تھی۔ میں نے دونوں سے خوب انصاف کیا اور پھر سو گیا۔ دوپہر کے وقت عالم بخش نے مجھے بیدار کر کے بتایا کہ اس کی بیوی نے میرے لیے خصوصی طور پر پلاؤ تیار کیا ہے۔ اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں خوب پیٹ بھر کر پلاؤ کھایا۔ عالم بخش کی بیوی یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئی کہ مجھے اس کا بنایا ہوا پلاؤ بہت پسند آیا تھا۔ سورج اب نصف النہار پر تھا اور خوب گرمی ہو گئی تھی۔ ریچھ کی تلاش کا یہ بہت موزوں وقت تھا کہ اس وقت ریچھ خوب گہری نیند سو رہے ہوتے ہیں۔

عالم بخش میرے ساتھ پہاڑی پر آیا اور پچاس گز کے فاصلے سے اس نے وہ غار دکھائی جہاں ریچھ رہتا تھا۔ میں نے ربر سول جوتے پہنے تھے سو انتہائی خاموشی سے غار کے قریب پہنچا۔ تاہم اس کا نقصان یہ تھا کہ گرم پتھر اب میرے تلوے جلا رہے تھے۔

غار کے منہ پر پہنچ کر میں اکڑوں بیٹھ کر پوری توجہ سے آوازیں سننے لگا۔

سوتا ہوا ریچھ زور زور سے خراٹے لیتا ہے جو انسان جتنے ہی بلند ہوتے ہیں۔ اگر ریچھ سو رہا ہوتا تو مجھے اس کے خراٹوں کی آواز آنی چاہیے تھی۔ دس منٹ میں سورج میری پشت جلانے لگا اور میں نے چند پتھر اٹھا کر غار کے اندر پھینکے۔

یہ بات عام فہم ہے کہ اس طرح کی مداخلت سے سویا ہوا ریچھ بہت غصے میں آ جاتا ہے۔ مگر غار میں خاموشی ہی رہی۔ میں نے پھر چند پتھر پھینکے مگر کچھ نہ ہوا۔ ریچھ اندر نہیں تھا۔

پہاڑی سے اتر کر میں نے عالم بخش کو بتایا کہ ریچھ موجود نہیں۔ پھر بتایا کہ میں بنگلور واپس جا رہا ہوں اور ریچھ کی اطلاع ملتے ہی مجھے تار بھیج دے۔ میں نے اسے کچھ پیسے دیے تاکہ فوری ضروریات پوری کرنے کے علاوہ تار بھی بھیج سکے۔ پھر میں بنگلور لوٹ آیا۔ ایک مہینہ گزر گیا مگر کوئی اطلاع نہ ملی۔

مزار کے دوسری جانب شمال مغرب میں بیس میل دور چک مگلور کا جنگل شروع ہوتا ہے جو میسور کے ضلع کدور میں واقع ہے۔ چک مگلور اور کدور کے وسط میں سیکری پنٹہ کا چھوٹا سا قصبہ ہے اور اس کے چاروں طرف جنگل ہے۔

ریچھ کی اگلی خبر مجھے سیکرے پنٹہ کے نزدیک سے ملی جہاں ریچھ نے دو لکڑہاروں کو زخمی کیا تھا اور ان میں سے ایک جاں بحق ہو گیا۔ چک مگلور نے فارسٹ آفیسر نے مجھے خط لکھ کر اس ریچھ سے دو دو ہاتھ کرنے کی درخواست کی۔

میں نے سوچا کہ یہ وہی ریچھ ہو گا جس نے عالم بخش کے بیٹے کو ہلاک کیا تھا۔ تاہم اتنے بڑے جنگل میں ایک ریچھ کو تلاش کرنا بھوسے کے ڈھیر سے سوئی تلاش کرنا کارِ دارد تھا۔ سو میں نے ڈی ایف او کو خط لکھا کہ وہ مجھے اس ریچھ کے بارے مزید معلومات بھیجے۔

دس روز بعد مجھے اس کا جواب ملا کہ اس ریچھ کے بارے کہا جاتا ہے کہ وہ قصبے سے تین میل دور ایک پہاڑی غار میں رہتا ہے۔ یہاں قریب سے ہی ایک راستہ گزرتا ہے جہاں گشت کرتے ہوئے فارسٹ گارڈ کو ریچھ نے زخمی کیا تھا۔

سو میں چک مگلور روانہ ہوا اور وہاں سے ڈی ایف او کو اٹھایا اور سیکری پنٹہ کا رخ کیا جہاں میسور کے محکمہ جنگلات کا چھوٹا ریسٹ ہاؤس ہے۔ یہاں اگلے چند روز میرا قیام ہونا تھا۔

قسمت سے اگلے روز دوپہر کو ایک بندہ دوڑتا ہوا آیا اور ہمیں بتایا کہ اس کا بھائی جو گڈریا ہے، ریچھ کی قیام گاہ والی پہاڑی کے پاس مویشی چرا رہا تھا کہ ریچھ نے اس پر حملہ کیا۔ اس نے مدد کے لیے شور مچایا تو ریچھ نے بھی غرانا شروع کر دیا۔ اس کا بھائی جو پہاڑی کے نیچے تھا، نے آوازیں سنتے ہی دوڑ لگائی اور ہمارے پاس آن کر دم لیا۔

ریچھ ہمیشہ شبینہ جانور ہوتے ہیں اور کبھی بھی دن کے وقت حرکت کرتے نہیں دکھائی دیتے۔ زیادہ سے زیادہ وہ صبح یا شام کے دھندلکے میں دکھائی دے سکتا ہے۔ مگر دوپہر کے وقت تو قطعی ناممکن ہے۔ شاید گڈریا ریچھ کے غار کے بہت قریب پہنچ گیا ہو گا جس سے ریچھ نے اس پر حملہ کر دیا۔ اس حملے کی یہی واحد توجیہہ تھی۔

ہمیں یہ خبر ساڑھے چار بجے کے قریب ملی، سو میں نے رائفل اور ٹارچ اٹھائی اور تین چار مددگاروں کو ساتھ لے کر روانہ ہوا تاکہ گڈریے کی مدد کروں۔ جلد ہی ہمیں احساس ہو گیا کہ فاصلہ گڈریے کے بھائی کی اطلاع سے کہیں زیادہ تھا۔ کم از کم چھ میل کا سفر طے کرنے کے بعد ہم اس پہاڑی کے قریب پہنچے جس پر گھنا جھاڑ جھنکار اور بانس کا جنگل بھی اگا ہوا تھا۔ چھ بج رہے تھے اور سردیوں کا موسم ہونے کی وجہ سے اندھیرا چھا رہا تھا۔ میرے ساتھ آئے آدمیوں نے آگے بڑھنے سے یکسر انکار کر دیا اور کہا کہ وہ سیکری پنٹہ جا رہے ہیں اور مجھے بھی یہی کہا کہ ابھی واپس چلوں اور اگلی صبح تلاش کا کام کریں گے۔ تاہم گڈریے کے بھائی نے کہا کہ وہ اسی جگہ رک کر میرا

انتظار کرے گا مگر جنگل میں جانے کی ہمت اس میں بھی نہیں تھی۔ اپنے بھائی کے محلِ وقوع کے بارے اس نے ہاتھ سے اشارہ کرکے بتایا کہ اس جگہ کہیں ہوگا۔

میں نے اس جگہ کا رخ کیا اور اس بندے کا نام بہ آوازِ بلند لیتا گیا۔ مجھے کوئی جواب نہ ملا سو میں نے مزید آگے گھنے جنگل کا رخ کیا۔ اس وقت تک تاریکی گہری ہو چکی تھی مگر مجھے مسئلہ نہیں ہوا کہ میرے پاس ٹارچ تھی۔ اس کی روشنی میں نے اِدھر اُدھر پھینکنا شروع کر دی۔

جلد ہی جنگل اتنا گھنا ہو گیا کہ مجھے رکنا پڑا۔ میں مڑنے ہی والا تھا کہ مجھے شبہ ہوا کہ ہلکی سی کراہ دور سے سنائی دی ہے۔ اس جگہ زمین پہاڑی کے دو چوٹیوں کے درمیان نیم وادی کی شکل میں نیچے اتر رہی تھی اور یہ کراہ وہیں کسی نشیب سے آئی تھی۔

گڈریے کا نام تھِما تھا اور دونوں ہاتھوں سے منہ پر پیالہ سا بنا کر میں نے اس کا نام زور سے پکارا اور پھر جواب سننے کی کوشش کی۔ ہاں، اب کے کراہ صاف سنائی دی جو مدھم مگر واضح تھی۔ یہ آواز سامنے سے ہی آئی تھی۔

جھاڑیوں سے زور آزمائی کرکے میں نیچے اترا اور جگہ جگہ پتھروں پھر پھسلتے ہوئے اور کانٹوں میں الجھتے ہوئے راستہ طے کیا۔ دو سو گز بعد میں نے پھر آواز دی۔ کچھ دیر بعد دائیں جانب سے آواز آئی۔ اسی طرح میں آگے بڑھتا رہا اور آخر کار تھِما کو تلاش کر لیا جو ایک درخت کے نیچے اپنے خون کے تالاب میں پڑا تھا۔ اس کا چہرہ تار تار اور ہڈیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کی زندگی کا واحد ثبوت اس کے منہ پر خون سے اٹھنے والے بلبلے تھے۔ مزید یہ بھی کہ ریچھ نے اس کے پیٹ پر پنجے مارے تھے جس کے سوراخ سے اس کی آنتیں نکلی ہوئی تھیں۔ جب میں نے اسے تلاش کیا تو

وہ بمشکل ہوش میں تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس نے میرے پکارنے پر کوئی جواب نہیں دیا تھا بلکہ وہ وقفے وقفے سے نیم بے ہوشی میں کراہ رہا تھا۔

صورتحال بہت نازک تھی۔ اگر یہ بندہ ساری رات یہیں پڑا رہتا تو صبح تک اس کا دم نکل جاتا۔ اس بندے کو اٹھا کر اس کے بھائی تک لے جانا ہی واحد حل تھا۔ مگر اسے کندھے پر ڈالنا بہت مشکل کام تھا کیونکہ اس کی حالت نازک تھی۔ مزید یہ کہ اس بندے کی جسامت بھاری تھی جو میرے برابر تھی۔ مگر اسے اٹھا کر میں نے رائفل کے کندے کا سہارا لے کر واپسی کا رخ کیا۔

اس خوفناک سفر کو میں دوبارہ کبھی نہیں کرنا چاہوں گا۔ میں چوٹی کے قریب پہنچا ہی تھا کہ حادثہ رونما ہوا۔ میرا بائیاں پیر پھسلا اور پھر میرا ٹخنہ دو بڑے پتھروں کے درمیان آیا۔ درد کی لہر اٹھی اور میں نیچے گرا اور تھِما میرے اوپر۔

میرے ٹخنے میں موچ آ گئی تھی اور چلنا ممکن نہ رہا۔ اس جگہ لیٹے ہوئے میں نے تھِما کے بھائی کو آوازیں دیں مگر ایک گھنٹہ گزر گیا مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ مجبوری میں اس دم توڑتے انسان کے ساتھ رات گزارنی تھی۔

ٹارچ کے سیل بچانے کی نیت سے میں اسے کم استعمال کر رہا تھا۔ صبح کے قریب بہت سردی ہو گئی اور تھما کی کراہیں مدھم ہوتی گئیں۔ پانچ بجے صبح اس کی جان نکل گئی اور میں اس کے ساتھ چھ بجے تک بیٹھا رہا۔

پھر میں نے کھڑے ہونے کی کوشش کی مگر پیر زمین پر رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ رینگنے کی کوشش کی تو خاردار جھاڑیاں رکاوٹ بن گئیں۔ میرے ہاتھ اور میرا چہرہ زخمی ہو گئے اور کپڑے پھٹ گئے۔ جلد ہی میں نے اس حقیقت کو قبول کر لیا کہ مجھے یہیں رک کر امداد کا انتظار کرنا ہو گا۔

دوپہر کے بعد محکمہ جنگلات کے لوگ تھِما کے بھائی اور دس بارہ دیہاتیوں کے ہمراہ آن پہنچے۔ آخرکار میری آوازوں کی مدد سے وہ لوگ یہاں تک پہنچ گئے۔ شام کو ہم سیکرے پنٹہ پہنچے جہاں میں بستر پر لیٹا تو میرا پیر بری طرح سوج چکا تھا۔ ڈی ایف او نو بجے آیا اور میری کار چلا کر مجھے چک مگلور لے گیا جہاں ہسپتال سے طبّی امداد لی۔ ایک ہفتے بعد جا کر میں زمین پر پیر رکھنے کے قابل ہوا۔ آپ کو اندازہ ہو چکا ہو گا کہ مجھے اس ریچھ کے خلاف کتنا غصہ جمع ہو گیا ہو گا۔ سو میں نے خود سے وعدہ کیا کہ جونہی چلنے کے قابل ہوا، اس ریچھ کو فنا کر دوں گا۔

اس دوران ریچھ نچلا نہیں بیٹھا اور اس نے دو مزید لوگوں کو اُسی راستے پر زخمی کیا۔

جب میں بمشکل چلنے کے قابل ہوا تو چار روز بعد میں سیکری پنٹہ پہنچ گیا۔ یہاں مجھے بتایا گیا کہ ریچھ اب گاؤں سے ایک میل دور کھیتوں میں مٹر گشت کا عادی ہو چکا ہے جہاں کئی درختوں کا پھل پکنے والا ہے۔ پانچ بجے میں ان درختوں کو پہنچ گیا اور سب سے بڑے درخت کو منتخب کیا جس پر سب سے زیادہ پھل لگے تھے اور اس کے نیچے رات گزارنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے درخت سے ٹیک لگا کر رائفل گھٹنوں پر رکھ لی۔

گیارہ بجے کے بعد مجھے ریچھ کا شور سنائی دیا جو بڑبڑاتا اور غراتا آ رہا تھا۔ جگہ جگہ رک کر وہ پھل کھاتا اور میرے قریب آتا گیا۔ راستے میں کئی جگہ اس نے مختلف جڑیں بھی کھود کر نکالی تھیں۔ اسے اس درخت تک آتے ہوئے ایک گھنٹہ لگ گیا۔ آخرکار جب سامنے آیا تو وہ ستاروں کی روشنی میں کالا دھبہ دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے ٹارچ کا بٹن دبایا اور روشنی کا دائرہ سیدھا ریچھ پر پڑا۔ ریچھ فوراً حیرت سے اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہوا اور میں نے اس کے سینے پر بنے V کے نشان کے عین وسط میں گولی پیوست کر دی۔ اس طرح یہ ببرا ریچھ اپنے انجام کو پہنچا۔

ریچھ کو جلدی غصہ آجاتا ہے مگر عام طور پر بے ضرر ہوتے ہیں۔ یہ ریچھ اپنی نسل سے مختلف تھا اور بغیر کسی وجہ کے انتہائی بے دردی سے لوگوں کو ہلاک کرتا رہا۔

۳ ماموندر کی آدم خور

یہ شیرنی جوان مادہ تھی اور بغیر کسی وجہ کے آدم خور بنی۔ چونکہ اس کی وارداتیں چملا وادی کے آدم خور کی ہلاکت کے کچھ عرصے بعد اور انہی علاقوں میں شروع ہوئی تھیں، اس لیے اندازہ ہے کہ شاید اس آدم خور کا جوڑا ہو۔ ایک اور نظریہ یہ تھا کہ اس شیرنی نے اپنی ماں سے کم عمری میں یہ عادت پائی ہو گی۔

اس کی آدم خوری کی وجہ چاہے جو بھی ہو، اس نے پہلی بار ایک گڈریے پر حملہ کر کے اسے ہلاک کرنے کی کوشش کی۔ تاہم اس کوشش کی وجہ یہ تھی کہ شیرنی نے پہلے ایک دودھیل گائے پر حملہ کر کے اس کی گردن توڑی ہی تھی کہ چرواہے نے اسے بھگانے کی کوشش کی۔ چرواہے نے اس کو بھگانے کے لیے شور کرتے ہوئے اپنا ڈنڈا لہرایا تھا۔ عام شیر ایسی مداخلت سے بھاگ جاتے ہیں مگر اس بار اس کا الٹا اثر ہوا۔ بھاگنے کی بجائے شیرنی نے جست لگائی اور چرواہے پر حملہ کر دیا اور چشمِ زدن میں بیس گز کا فاصلہ طے کر کے حملہ کر دیا۔ چرواہا مڑ کر بھاگا مگر شیرنی کے پنجے نے اس کے کندھے سے کولہوں تک اسے چھیل کر رکھ دیا۔ چرواہا زمین پر گرا۔ چونکہ انسان پر شیرنی کا یہ پہلا حملہ تھا تو بظاہر شیرنی اس وار کو کافی سمجھ کر پھر گائے کو لوٹ گئی۔

جب شیرنی نے گائے کو کھانا شروع کیا تو چالیس گز دور چرواہے شیرنی کے پیٹ بھرنے کی آوازیں سنتا رہا مگر اس نے بھاگنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر وہ ایسا کرتا تو اس بار شیرنی کا حملہ مہلک ثابت ہوتا۔ سو وہ اسی طرح اوندھا پڑا رہا مگر نہایت آہستگی سے سر موڑ کر شیرنی کو پیٹ بھرتے دیکھتا رہا۔

بعد میں اس نے مجھے بتایا کہ اسے وہ ایک گھنٹہ ساری عمر یاد رہے گا۔ بظاہر کئی مرتبہ رک کر شیرنی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ایک بار تو کھانا چھوڑ کر شیرنی نے اس کی سمت چند قدم بھی اٹھائے۔

شکر ہے کہ دہشت کے مارے یہ بیچارہ حرکت نہ کر سکا۔ اگر وہ ذرا سی بھی حرکت کرتا تو ظاہر ہے کہ شیرنی اسے زندہ نہ چھوڑتی۔ خوش قسمتی سے شیرنی نے ارادہ بدل دیا۔

مزید ایک گھنٹہ گزرا اور پھر شیرنی کا پیٹ بھر گیا۔ پھر وہ پچھلے پیروں پر بیٹھ کر اپنے اگلے پنجے اور چہرہ چاٹ کر صاف کرتی رہی۔ پھر چرواہے پر آخری نگاہ ڈال کر شیرنی اٹھی اور جنگل کو چلی گئی۔

چرواہا بیچارہ مزید دس منٹ لیٹا رہا کہ شیرنی واقعی چلی گئی ہے۔ پھر وہ اٹھا اور گاؤں کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔

اس کہانی کا انجام بھی یادگار تھا۔ کسی مناسب طبّی امداد کے بغیر ہی اس کے گہرے زخم بھر گئے۔ حکیم نے اس کے زخموں پر گائے کا گوبر اور چند جڑی بوٹیاں کچل کر باندھی تھیں۔ شاید اس نے جو چادر اوڑھی ہوئی ہو، اس نے شیرنی کے پنجوں سے زہریلے مادے کو روک دیا ہو۔

یہ واقعہ ماموندر کے ریلوے سٹیشن سے بمشکل چار میل دور ہوا تھا اور وہاں پہاڑی اچانک تین سو فٹ نیچے جا کر جنگل میں بدل جاتی ہے۔ یہاں ایک ندی بھی بہہ رہی تھی۔

زخمی ہونے کا اگلا واقعہ ایک موت پر منتج ہوا۔ اس بار بھی مویشیوں کے ریوڑ پر حملہ ہوا تھا اور بوڑھا آدمی زخموں کی تاب نہ لا کر مر گیا۔ اس بار بھی تقریباً پچھلے واقعے کی طرح واقعات ہوئے۔ شیرنی جنگل میں ریلوے لائن سے ایک میل دور چرنے والے ریوڑ پر حملہ آور ہوئی اور ایک بار پھر دودھیل گائے کو نشانہ بنایا۔ جب خوفزدہ مویشی بھاگ کر چرواہے کے پاس پہنچے تو وہ جائزہ لینے خود آیا۔ جلد ہی اس نے شیرنی کو مردہ گائے پر دیکھا۔ تاہم اس بار وہ شیرنی کو دیکھتے ہی وہیں رک گیا۔ مگر شیرنی کو اس کی موجودگی پسند نہیں آئی اور اس نے حملہ کر کے اسے بری طرح زخمی کر دیا۔ پھر وہ مردہ گائے کو گھسیٹ کر جھاڑیوں میں لے گئی۔

تین گھنٹے بعد مدد پہنچی۔ مویشی ریلوے لائن کو عبور کر گئے تھے۔ اس بندے کا بھائی تلاش میں نکلا تو دیکھا کہ مویشی تو موجود ہیں مگر رکھوالا غائب ہے۔ ریلوے لائن پر کھڑے ہو کر اس نے بھائی کو کئی آوازیں دیں مگر جواب نہ ملا۔ اسے گڑبڑ کا احساس ہوا تو وہ بھاگ کر ماموندر سے مدد لانے چلا گیا۔

کھوجی جماعت نے مویشیوں کے نشانات کا تعاقب کیا اور زخمی بندے تک آن پہنچے۔ جریانِ خون اور زخموں سے وہ بندہ قریب المرگ اور بیہوش تھا۔ وہ اسے اٹھا کر پہلے گاؤں اور پھر ریلوے سٹیشن لائے تا کہ مال گاڑی میں گارڈ کے ڈبے میں اسے نزدیکی قصبے رانی گنٹا لے جائیں۔ اُس جگہ ہسپتال تھا۔ مگر بوڑھا آدمی مال بردار گاڑی کے سفر میں ہی مر گیا۔

تیسری واردات کے بعد جا کر شیرنی نے آدم خوری شروع کی۔ اس بار بھی اس نے چرواہے پر حملہ کیا مگر اس بار یہ حملہ صبح نو بجے ہوا۔ اس حملے کے بارے ہمیں دوسرے چرواہے نے بتایا جو اس کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ شیرنی حسبِ معمول بھاگ کر آئی اور ایک کم عمر بیل پر حملہ کیا مگر اسے گرانے میں ناکام رہی۔ بیل اپنی پشت پر سوار شیرنی کو لے کر چرواہوں کی جانب بھاگا۔ زندہ بچنے والا بندہ مڑ کر بھاگا۔ دوسرا حیرت اور خوف کے مارے وہیں گڑ گیا۔ بھاگنے والے نے ایک بار مڑ کر دیکھا تھا کہ شیرنی بیل کی پشت سے جست لگا کر اس بندے پر حملہ آور ہوئی۔ پھر اس نے دوبارہ مڑ کر نہیں دیکھا۔

امدادی جماعت لاٹھیوں اور توڑے دار بندوقوں سے مسلح ہو کر پہنچے تو چرواہے کی لاش نہ ملی۔ سو اس جماعت نے گاؤں جا کر مزید افراد کو اپنے ساتھ ملایا اور تقریباً تین گھنٹے بعد سو آدمی جمع ہو کر

تلاش کو نکلے۔ نشانات واضح تھے اور جلد ہی وہ متوفی کی لاش پر پہنچ گئے جو اوندھی ایک نالے کے اندر ریت پر پڑی تھی۔ اس کے کولہوں اور سینے کا کچھ گوشت کھایا جا چکا تھا۔

اگلے دو ماہ میں شیرنی نے تین اور انسانوں کو اپنا لقمہ بنایا۔ ان میں سے ایک چرواہا تھا جبکہ دوسرا مسافر اور تیسرا ایک لمبانی تھا جو جنگل سے شہد جمع کرنے نکلا تھا۔ اس کے بعد مویشی جنگل میں بھیجنے اور شہد جمع کرنے کا کام روک دیا گیا۔ مسافروں نے بھی پیدل سفر کرنا بند کر کے ٹرین سے سفر شروع کر دیا۔

اُس وقت محکمہ جنگلات کا ضلعی افسر لٹل ووڈ تھا اور اس نے مجھے خط لکھ کر دعوت دی کہ میں اگلے چند روز اس کے ساتھ مامونڈر کے خوبصورت فارسٹ بنگلے میں اس کے ساتھ گزاروں اور شیرنی کو مارنے کی کوشش کروں۔ پندرہ روز کی چھٹی لے کر میں نے بنگلور سے رات والی میل ٹرین پکڑی اور اگلے دن ساڑھے تین بجے دوپہر میں مامونڈر اترا کہ یہ ٹرین بہت سست چلتی ہے۔

فارسٹ بنگلا سٹیشن سے سات فرلانگ دور ایک بنجر پہاڑی پر واقع ہے۔ اس بنگلے کو جانے والا راستہ مامونڈر سے گزر کر جاتا ہے جہاں رک کر میں سب کو اپنی آمد کا سبب بتا دیا کہ میں یہاں اس شیرنی کو ہلاک کرنے آیا ہوں۔ میرا مقصد یہ تھا کہ لوگ اس خبر کو زیادہ سے زیادہ پھیلا دیں۔ اس طرح مجھے نہ صرف شیرنی کے بارے پوری تفاصیل مل جاتیں بلکہ کسی بھی انسان یا جانور پر ہونے والے نئے حملے کا بھی پتہ چلتا رہتا۔ میں نے یہاں تین بھینسے بھی خریدے اور ایک مقامی شکاری اروکیا سوامی کے ذمے لگا دیے۔ یہ شکاری پہلے سے میرے لیے کام کر رہا تھا۔

اس بنگلے کا برآمدہ لمبا اور چوڑا تھا۔ یہاں سے پانچ مختلف فائر لائن یا فارسٹ لائن نکلتی تھیں۔ جنوب اور جنوب مغرب کو جانے والی لائنیں گاؤں اور ریلوے لائن کے قریب سے گزرتی تھیں۔

باقی تین جنگل میں دور تک جاتی تھیں اور انسان کئی میل دور تک دیکھ سکتا تھا۔ شمال والی فائر لائن اس جگہ جاتی تھی جہاں پہلا چرواہا زخمی ہوا تھا۔ مشرق اور شمال مشرق کی جانب یہ بالکل سیدھی جاتی تھیں۔ ہر طرف زمین مسطح تھی۔

بہت برس قبل جب یہاں شکار بکثرت ہوتا تھا، میں نے بہت مرتبہ برآمدے یا صحن میں کھڑے ہو کر دوربین کی مدد سے ان فارسٹ لائنوں پر جنگلی جانوروں کو علی الصبح یا شام کے وقت گزرتے دیکھا تھا۔ سانبھر، چیتل اور مور تو بکثرت انہیں عبور کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ تین بار ریچھ بھی انہیں عبور کرتے دیکھے تھے اور ایک بار شام پانچ بجے بھی ریچھ یہاں سے گزرتا دیکھا تھا۔ دو میل دور میں نے گیارہ جنگلی کتوں کو ایک بوڑھے ریچھ کا گھیراؤ کرتے دیکھا تھا۔ ریچھ کو عبرتناک انجام سے بچانے کے لیے میں پیچھے لپکا۔ تین کتے میری گولی کا شکار ہوئے تو اس کے ساتھیوں کو خطرے کا احساس ہوا۔ چوتھے کتے کی ہلاکت پر ان کا پورا گروہ بھاگ نکلا۔ جتنی دیر وہ نظروں سے اوجھل ہوتے، پانچواں کتا بھی اپنے انجام کو پہنچا۔

ان دنوں میرے پاس اعشاریہ ۴۰۵ بور کی ونچسٹر تھی اور اب پانچوں گولیاں چلانے کے بعد خالی رائفل ہاتھ میں تھامے مجھے احساس ہوا کہ اب میرا سامنا غصے سے پاگل ریچھ سے ہے جو کتوں کے ہاتھوں زخمی بھی ہو چکا ہے۔

میں اس سے ساٹھ گز دور تھا کہ ریچھ نے سیدھا مجھ پر حملہ کر دیا۔ 'ووف ووف' کرتا ہوا آیا اور میں نے فارسٹ لائن پر دوڑ لگا دی اور ساتھ ہی ساتھ رائفل میں گولی بھر کر رائفل کو تیار کر لیا۔ پھر مڑ کر میں نے ریچھ کی طرف رخ کیا جو اب محض پندرہ گز دور تھا۔ عام ریچھوں کی مانند

پانچ گز کے فاصلے پر پہنچ کر وہ پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہوا اور ہاتھ اٹھائے۔ اس عمل کو ریچھ کا معانقہ کہتے ہیں اور ہر کوئی اس مہلک معانقے سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔

تاہم ہندوستانی ریچھ ایسا معانقہ نہیں کرتے بلکہ پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہو کر ریچھ اپنے تین انچ لمبے ناخنوں سے شکار کا منہ نوچ لیتے ہیں یا پھر اس کے سر کو چبانے لگتے ہیں۔ تاہم جب ریچھ بلند ہوا تو اس کے سینے پر V کا نشان واضح دکھائی دینے لگا۔ ایک ہی کارتوس رائفل میں تھا، سو میں نے عین اسی نشان کے نچلے سرے پر گولی چلا دی اور ریچھ مجھ سے دو گز دور گرا اور مر گیا۔

تین جنگلی کتے نر اور دو مادہ تھے۔ محکمہ جنگلات ہر نر کے بدلے دس روپے اور مادہ کے بدلے پندرہ روپے کا انعام دیتا ہے۔ جنگلی کتے ہرنوں کے لیے انتہائی نقصان دہ ہیں اس لیے ان کی تباہی کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ تاہم مجھے ریچھ کی ہلاکت پر افسوس ہوا کہ ریچھ نے مجھے اس پر مجبور کر دیا تھا۔

تاہم یہ سب بہت عرصہ قبل ہوا تھا۔

اس بنگلے کو ایک اور چیز مرغوب بناتی ہے۔ دن کو دو بجے کے بعد سمندر کی جانب سے ٹھنڈی ہوا چلنا شروع ہو جاتی ہے۔ میرے خیال میں اس بنگلے سے براہ راست اگر دیکھا جائے تو خلیج بنگال پچہتر میل سے کم نہیں۔ میں اتنا ماہر تو نہیں کہ کہہ سکوں کہ سمندر کی ہوا کتنے فاصلے پر پہنچ کر بے اثر ہو جاتی ہے۔ البتہ مجھے اتنا علم ہے کہ ہر روز دو بجے کے بعد یہ بنگلہ کافی ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور قیلولہ کرنے میں

بہت مزہ آتا ہے۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو ماموندر کے فارسٹ بنگلے کا چکر لگا لیں۔

بھینسے ساڑھے پانچ آن پہنچے سو اس روز بہت دیر ہو گئی، سو میں نے ایک بھینسا دو میل دور شمالی فائر لائن پر املی کے بڑے درخت کے نیچے باندھا۔ سات بجے کے بعد میں واپس بنگلے پہنچا اور گیراج میں دیگر دو بھینسے باندھ دیے اور ارکیا سوامی سے کہا کہ وہ باورچی خانے میں سو جائے۔

اگلی صبح ہم باہر نکلے۔ سب سے پہلے ہم نے رات والے گارے کا معائنہ کیا جو زندہ سلامت تھا اور اسے عین اُس جگہ لے گئے جہاں پہلی واردات ہوئی تھی۔ یہاں ہم نے بھینسے کو گھاس کے ایک خوبصورت قطعے میں درخت کی جڑ سے باندھ دیا۔

ہم بنگلے واپس لوٹے اور دوسرے بھینسے کو مشرق کو جانے والی فائر لائن پر لے گئے اور تقریباً اسی جگہ جا کر باندھ دیا جہاں ریچھ اور جنگلی کتوں والا واقعہ ہوا تھا۔

پھر بنگلے کو لوٹ کر ہم نے تیسرا بھینسا ریلوے لائن کے مغرب میں لے جا کر وہاں باندھا جہاں بوڑھا چرواہا ہلاک ہوا تھا۔

جب ہم تیسری بار بنگلے لوٹے تو گرمی بہت بڑھ چکی تھی۔ پسینے سے بھیگی اپنی قمیض اتار کر میں نے ٹھنڈا کھانا کھایا اور سمندری ہوا کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے علم تھا کہ یہ ہوا دو بجے شروع ہو جائے گی۔ عین دو بجے ہوا چلنا شروع ہوئی اور انتہائی گرم برآمدہ اچانک ٹھنڈا ہونے لگا۔

اگلے دو دن بیکار گزرے۔ میں ہر روز گاروں کا انتظار کرتا مگر انہیں کوئی نقصان نہ پہنچا۔ پانچویں روز کی شام کو تکلیف دہ حادثہ پیش آیا۔

جنوبی ہندوستان میں ریلوے لائن کے کنارے رات کے وقت مٹی کے تیل سے جلنے والے اشارے استعمال ہوتے ہیں مگر بڑے ریلوے جنکشنوں کے شنٹنگ یارڈ پر ایسا نہیں ہوتا۔ آپ کو علم ہوگا کہ ہر ریلوے سٹیشن پر دو اشارے دونوں سمتوں میں ہوتے ہیں۔ نزدیکی اشارے کو ہوم سگنل اور بیرونی کو آؤٹر سگنل کہتے ہیں۔ عام طور پر ریلوے ملازم ہر روز شام کو چھ بجے ان لیمپوں کے شیشے صاف کرکے بتی کو تراشتے ہیں اور پھر جلا کر واپس آ جاتے ہیں۔ تاہم مامونڈر کی آدم خور شیرنی کی وجہ سے اور چونکہ دونوں سمتوں کے آؤٹر سگنل عین جنگل میں تھے، یہ کام سورج غروب ہونے سے قبل پانچ بجے سے پہلے سرانجام دے دیا جاتا تھا۔

اس شام کو چار بجے دو پوائنٹس مین سنگل جلانے نکلے۔ دونوں نے مخالف سمتوں کا رخ کیا۔ دوسرا پوائنٹس مین واپس نہ لوٹا۔

چھ بجے سے ذرا قبل سات افراد کی جماعت دوڑتی ہوئی بنگلے میں اطلاع دینے آئی۔ انہیں سٹیشن ماسٹر نے بھیجا تھا۔ رائفل، ٹارچ اور رت جگے کے لیے درکار دیگر چیزیں اٹھاتے ہوئے میں نے ان لوگوں کو ارکیاسوامی کے ساتھ سٹیشن بھیجا کہ وہ اب رات کو اکیلا بنگلے میں رہنے کے خیال سے دہشت زدہ تھا۔ پھر میں نے مغرب کو جانے والے فارسٹ لائن کا رخ کیا جس کے بارے مجھے علم تھا کہ یہ اندرونی اور بیرونی سگنلوں کے درمیان سے گزرتی تھی۔

جب میں ریلوے لائن کو پہنچا تو اس جگہ وہ زمین سے دس فٹ اونچی گزرتی ہے، میں نے بائیں جانب دیکھا تو پتہ چلا کہ اندرونی سگنل چمک رہا تھا۔

میں نے سوچا: 'احمق آدمی، ابھی دن موجود تھا تو اسے پہلے بیرونی سگنل جلانا چاہیے تھا اور پھر اندرونی سگنل کو جاتا۔ اس طرح اس نے پہلے اندرونی سگنل جلایا جس سے کافی وقت ضائع ہو گیا۔

پھر دائیں جانب مڑ کر میں آؤٹر سگنل کو گیا جو موڑ مڑنے کے بعد دکھائی دیا۔ چلتے ہوئے میں زمین پر غور سے دیکھتا گیا کہ حملہ یہیں کہیں ہوا ہوگا مگر مجھے کوئی نشان نہ دکھائی دیا۔ جب میں نے آؤٹر سگنل کے پاس پہنچ کر سر اٹھایا تو دیکھا کہ یہ روشن تھا۔ یعنی پوائنٹس مین دراصل بیرونی سگنل جلائے جانے کے بعد ہلاک ہوا۔ اندرونی سگنل بھی جل رہا تھا۔ یعنی سنگل مین کی ہلاکت اندرونی سنگل اور سٹیشن کے درمیان کہیں ہوئی تھی۔

مگر ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ اندرونی سنگل سے بھی پہلے کھیت تھے جو سٹیشن تک پھیلے ہوئے تھے۔ سو کوئی شیر چاہے وہ آدم خور ہی کیوں نہ ہو، کیا دن کے وقت کھلے میں آ سکتا ہے؟ ایسا ہونا ممکن تو تھا مگر امکان بہت کم تھا۔

میری گھڑی پر ۶ بج کر ۵۵ منٹ ہو رہے تھے اور اندھیرا چھانے لگا تھا۔ اس لیے میں نے بہت محتاط ہو کر اندرونی سگنل کو گیا۔ خوش قسمتی سے چاند نکل آیا تھا اور چاندنی سے اندھیرا چھٹ گیا تھا۔

جہاں میں پہلے پہنچا تھا، وہاں آیا تو دیکھا کہ فارسٹ لائن کی طرف سے ایک نالی آ رہی تھی جو گہرے نالے میں بدل جاتی تھی۔ وہاں مجھے ریلوے کے سلیپروں کے نیچے کوئی چیز پھڑ پھڑاتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں رکا اور جھک کر سلیپروں کے درمیان دیکھا۔

یہ متوفی کی سفید دھوتی تھی جو پتھر میں پھنسی ہوئی تھی۔ اس سے بیس فٹ دور ایک تاریک چیز دکھائی دی جو مجھے علم تھا کہ متوفی کی لاش ہوگی۔ اس کم روشنی میں بھی میں بتا سکتا تھا کہ اتنی مختصر مدت میں ہی اس لاش کو جزوی طور پر کھایا گیا ہے۔ گردن پوری طرح چبائی گئی تھی اور سر الگ ہو کر ایک گز دور پڑا تھا۔ شاید شیرنی اس وقت بھی پاس ہی کہیں چھپی ہوئی ہو یا مجھے دیکھ رہی ہو، سو نیچے اتر کر لاش کا تفصیلی معائنہ کرنا فضول ہوتا۔

بعجلت جائزہ لیا تو فیصلہ کیا کہ میں ریلوے کی پٹری پر آڑا لیٹنا ہی پڑے گا۔ یہ جگہ نالے کے عین وسط میں تھی۔ اس طرح میں سامنے اور پیچھے سے حملے سے محفوظ رہتا کہ شیرنی کو نالے کی تہہ سے کم از کم پندرہ فٹ کی چھلانگ لگانی پڑتی۔ اس طرح شیرنی دائیں یا بائیں سے حملہ کرتی۔ میں یہ بتانا بھول گیا تھا کہ نالے کی چوڑائی بیس فٹ تھی۔ اگرچہ یہ زیادہ نہیں مگر مجھے اتنا وقت مل جاتا کہ شیرنی کی آمد سے خبردار ہو جاتا۔

یہ بھی ممکن تھا کہ شیرنی نالے کے کنارے پر چڑھ کر جست لگاتی، جو میرے پیچھے یا اطراف سے بھی ہو سکتا تھا۔ تاہم یہ خطرہ مول لینا ہی تھا۔

بنگلے سے روانہ ہوتے وقت میں نے ٹارچ کو رائفل پر لگا لیا تھا۔ میں نے اپنا تھیلا اپنے سامنے رکھا اور اس پر اوندھا لیٹ گیا۔ یہ پٹڑی براڈ گیج تھی اور دونوں پٹڑیوں کا درمیانی فاصلہ ساڑھے پانچ فٹ تھا۔ اپنی ٹانگیں پھیلائیں تو پیروں کے تلوے دوسری پٹڑی کو چھونے لگے۔ میں آٹھ انچ چوڑے ٹیک کی لکڑی کے سخت سلیپر پر لیٹا تھا۔

چاند خوب چمک رہا تھا اور پورا منظر واضح دکھائی دے رہا تھا۔ لاش اور اس کا سر مجھے صاف دکھائی دے رہے تھے جو نالے کی باریک ریت پر پڑے تھے۔ ہر طرف موت کا سا سکوت چھایا ہوا تھا۔

لال رنگ کا آؤٹر سگنل مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا۔

گھنٹے گزرتے رہے۔ مغرب کی سمت جنگل سے سانبھر کی آواز سنائی دی۔ شاید شیرنی کو دیکھ کر سانبھر بولا ہو؟ نہیں، دوسرے سانبھر نے شمال مشرق سے جواب دیا اور تیسرے کی آواز مشرق سے ائی۔ وقفے وقفے سے چیتل بھی آوازیں نکالتے رہے۔

تاہم یہ ساری آوازیں مختلف سمتوں سے آتی رہیں، اگر آواز ایک سمت سے آ رہی ہوتی تو اس کا مطلب کسی درندے کی موجودگی ہوتی۔ مگر ہر طرف سے آنے والی آوازیں بتا رہی تھیں کہ کئی درندے نکلے ہوئے ہیں۔ چاندنی رات کی وجہ سے عین ممکن ہے کہ جنگلی کتوں کا غولِ بیابانی شکار پر نکلا ہو۔ جنگلی کتے عموماً دن کے وقت یا پھر بعض جنگلوں میں چاندنی رات کو بھی شکار پر نکلتے ہیں مگر تاریک راتوں میں دکھائی نہیں دیتے۔

نصف شب کو خاموشی چھا گئی۔ پھر اچانک میرے رونگٹے کھڑے ہونے لگے کیونکہ ایک عجیب منظر دکھائی دیا۔ کٹا ہوا سر اچانک ایک جانب لڑھک گیا۔

ابھی تک اس کا رخ آسمان کی جانب تھا مگر اب اس کی بے جان آنکھیں میری جانب ہو گئیں۔ حالانکہ کسی جانور نے اسے نہیں چھوءا۔ یہ سر کھلی جگہ چاندنی تلے صاف دکھائی دے رہا تھا۔

پھر سر نے دوبارہ حرکت کی اور واپس پہلی حالت میں چلا گیا۔ پھر نصف مڑا اور جیسے حرکت کی سکت نہ ہو، رک گیا اور پھر مڑ کر اپنی بے جان آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں بتاتا چلوں کہ میں توہم پرست نہیں اور نہ ہی اندھیرے سے ڈرتا ہوں۔ میں نے بے شمار راتیں اس سے بھی خطرناک جگھوں پر گزاری ہیں۔ میں نے ادھ کھائی انسانی لاشوں پر بھی آدم خور کا انتظار کرتے ان گنت راتیں بسر کی ہیں اور پہلے بھی مجھے ایسے لگا تھا کہ جیسے لاشیں حرکت کر رہی ہوں۔ مگر کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ کٹا ہوا سر اپنے آپ اس طرح ہلا ہو۔

انتہائی شدید خوف نے مجھے جیسے جکڑ لیا ہو اور دل چاہا کہ اٹھ کر بھاگ جاؤں۔ مگر پھر عقلِ سلیم نے تسلی دی کہ مردہ انسانی سر کسی بھی قیمت پر خود سے نہیں ہل سکتا۔ مگر پھر کس چیز نے اسے ہلایا ہوگا؟

میں نے سر کو بغور دیکھا اور پھر چاندنی میں مجھے جواب مل گیا۔ سفید ریت پر دو تاریک جسم ہلتے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ دو کالے گوبریلے تھے جو ڈیڑھ انچ لمبے ہوتے ہیں۔ انہیں Rhinoceros beetles کہتے ہیں اور ان کی ناک لمبوتری ہوتی ہے۔ عام طور پر یہ شبینہ ہوتے ہیں مگر علی الصبح یا شام کو بھی جنگل میں دکھائی دے جاتے ہیں اور عموماً گوبر کی گیند بنا کر اسے لڑھکائے جا رہے ہوتے ہیں جو ان سے دو یا تین گنا زیادہ بڑی ہوتی ہے۔

دونوں گوبریلوں نے مل کر ایک بار سر کو حرکت دے دی مگر دوسری بار کامیاب نہ ہو پائے۔ میں اس منظر میں اتنا کھو گیا تھا کہ مجھے شیرنی یکسر بھول گئی تھی۔ اگر شیرنی حملہ کرتی تو میں بالکل تیار نہ ہوتا۔

ایک بج کر چالیس منٹ پر پٹڑیاں لرزنے لگیں۔ پھر مجھے دور سے آواز نزدیک ہوتی سنائی دی۔ پھر تیز سیٹی کی آواز نے ماحول درہم برہم کر دیا اور پھر انجن کی طاقتور روشنی مجھ پر پڑی۔ مدراس سے بمبئی جانے والی نائٹ میل ٹرین تھی۔

بادلِ نخواستہ میں اٹھا اور اپنا تھیلا اٹھا کر نالے کے کنارے پٹڑی سے دو فٹ دور چلا گیا۔ تاہم مجھے ٹرین ڈرائیور یاد نہ رہا۔ اس نے روشنی میں مجھے دیکھ لیا تھا مگر میری رائفل اسے دکھائی نہ دی۔ چند منٹ بعد اس نے مجھے بتایا کہ وہ سمجھا کہ میں خودکشی کرنے لیٹا تھا اور عین وقت پر ہمت جواب دے گئی تو اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ بتاتا چلوں کہ ہندوستان میں خودکشی کا یہ طریقہ کافی مقبول ہے۔

خیر، بریکوں کی آواز اور بھاپ کی سیٹی کے بعد ٹرین مجھ سے تھوڑا آگے جا کر رکی۔ اگلے لمحے بھاری بوٹوں کی دھمک ہوئی اور کئی لوگ میری جانب لپکے۔ یہ ڈرائیور اور دو فائر مین تھے جو انجن سے اترے۔

آتے ہی انہوں نے مجھے دبوچ لیا۔ پھر انہیں احساس ہوا کہ انہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس دوران بوگی کی کھڑکیوں سے لوگوں نے سر نکال کر دیکھنا شروع کر دیا اور سینکڑوں آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ گارڈ بھی ٹرین کے عقب سے آیا۔ سو انہیں حقیقت بتانی ہی پڑی۔

'لاش کہاں ہے؟' ادھیڑ عمر اینگلو انڈین ڈرائیور نے پوچھا۔ میں نے لاش کی جانب اشارہ کیا۔ 'تم یہاں اکیلے لیٹے ہوئے ہو؟' اس نے غیر یقینی سے پوچھا۔

جب میں نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے کہا، 'پاگل' اور ساتھ اپنی کھوپڑی کی طرف اشارہ کیا۔ دونوں فائر مین اور ہندوستانی گارڈ نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

چند منٹ بعد ٹرین بمبئی کو اپنے سفر پر روانہ ہو گئی اور میں پھر اکیلا رہ گیا۔ اتنے شور و غل کے بعد شیرنی کا آنا ناممکن لگ رہا تھا۔

اڑھائی بجے پھر پٹڑیاں لرزنے لگیں۔ اس بار انجن کی روشنی پڑنے سے قبل ہی میں کنارے پر لیٹ گیا اور رائفل چھپا دی۔ نتیجتاً مال بردار گاڑی بغیر رکے نکل گئی۔ چار بجے پھر ایسا کرنا پڑا اور اس بار ریٹرن میل ٹرین تھی جو پوری رفتار سے بمبئی سے مدراس جا رہی تھی۔ میل ٹرینیں ماموندر پر نہیں رکتیں۔

صبح کاذب آئی اور چلی گئی۔ پھر دور سے بیدار ہوتے مور کی آواز سنائی دی جس کے فوراً بعد جنگل کے سب سے پیارے پرندے بھورے جنگلی مرغ کی آواز آئی۔

ہلکے گلابی رنگ کی لکیر مشرقی پہاڑیوں پر دکھائی دی جو کالے آسمان میں واضح دکھائی دے رہی تھی۔ اسی دوران ساری رات چمکنے کے بعد چاند غروب ہونے والا تھا اور اب مدھم پڑنا شروع ہو گیا۔

پھر گلابی رنگ مدھم ہوتا ہوا سرخی مائل اور پھر سبز اور نیلے رنگوں کے امتزاج کے ساتھ بدلتا رہا۔ پھر اس کا رنگ عنابی مائل زرد ہوا اور پھر نارنجی اور پھر گہرا سرخ اور پھر سورج مشرقی پہاڑیوں کے اوپر سے نمودار ہوا۔

سورج کی روشنی بڑھنے لگی اور آخرکار پورا سورج نکل آیا۔ آسمان پر خوبصورت بادل دکھائی دے رہے تھے۔ پھر اچانک سارے جنگل سے اندھیرا چھٹ گیا اور سورج کی روشنی ہر جگہ پڑنے لگی۔

ایک نیا دن نمودار ہوا اور اپنے ہمراہ پورے جنگل کے پرندوں کی خوبصورت چہکار لے کر آیا۔ ہر جھاڑی اور ہر درخت زندگی سے بھرپور اور تازہ دم تھا۔ ہندوستانی جنگلوں میں طلوعِ آفتاب دیکھنے والے لوگ کبھی وہ منظر نہیں بھول سکتے۔

سر کا رخ اب بھی میری جانب تھا مگر اس نے دوبارہ حرکت نہیں کی۔ اسے حرکت دینے والے گوبریلے کب کے جا چکے تھے۔

میں نے سٹیشن کا رخ کیا اور مایوسی سے سٹیشن ماسٹر کو حالات سے آگاہی دی کہ وہ متوفی کی لاش کو شمشان گھاٹ بھجوا دے۔ آٹھ بجے میں بنگلے کے برآمدے میں سو رہا تھا۔ دوپہر کو سمندری ہوا سے میری نیند اور بھی گہری ہو گئی۔

چار بجے میں اٹھا تو بالکل تازہ دم تھا اور جلدی جلدی دوپہر کا کھانا کھا کر چائے پی۔ اتنی دیر میں ارکیا سوامی نے بتایا کہ وہ چار دیگر افراد کے ساتھ گاروں کو دیکھنے گیا تھا اور سبھی بعافیت تھے۔ لگتا تھا کہ شیرنی انہیں نہیں مارنے والی۔

پھر مغرب کا وقت ہوا اور بہترین چاندنی پھیل گئی۔ میرا دل چاہا کہ گشت کروں۔ اگر میں فائر لائن کے عین وسط میں چلتا تو محتاط چلتے ہوئے میں محفوظ رہتا۔ اس کے علاوہ یہ شیرنی کو للچانے کا بھی ایک طریقہ تھا۔

میں اپنے ہمراہ خاکی کپڑے اور کالی قمیض لایا تھا جو رات کو مچان پر بیٹھنے کے لیے ہی مناسب ہوتے ہیں۔ سو میں نے ارکیا سوامی کے گھر جا کر اس کی لمبی سفید قمیض مانگی اور نیچے خاکی پتلون پہنی ہوئی تھی۔ پھر ارکیا سوامی نے میرے سر پر پگڑی بھی باندھ دی۔

پتہ نہیں کہ مجھے دیکھ کر شیرنی کو کیا محسوس ہوتا مگر دیہاتی لوگ میرا منصوبہ سن کر کافی پریشان ہوئے۔

کچھ دیر تو میں سوچتا رہا کہ کون سی فائر لائن لوں پھر میں نے مشرقی سمت جانے والی لائن پکڑ لی۔ ساڑھے سات بجے گشت کا آغاز ہوا۔ میں لائن کے عین وسط میں چل رہا تھا اور آنکھوں کو حرکت دیتے ہوئے دونوں اطراف سے پوری طرح چوکنا تھا۔ وقتاً فوقتاً میں اپنے عقب میں بھی دیکھ لیتا۔

اگرچہ چاندنی خوب چھٹکی ہوئی تھی مگر جھاڑیوں کے نیچے تاریکی ہی تھی۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ چاندنی کے باوجود مجھے جھاڑیوں میں بیٹھے درندے کو دیکھنا کارِ دارد ہوگا اور یہ شیرنی تو ویسے بھی چھپی ہوئی ہوگی۔ اس لیے میں نے سماعت پر بھروسہ کیا اور ساتھ چھٹی حس بھی تو موجود تھی۔

ہر دس منٹ بعد میں سیٹی پر کوئی نہ کوئی دھن بجاتا تاکہ شیرنی کی توجہ اپنی طرف مرکوز کر سکوں۔ ہر تیس سیکنڈ بعد اسے روک دیتا تاکہ میرے کانوں کو آوازیں سننے میں مشکل نہ ہو۔

جھاڑیوں سے بھری کئی پہاڑیوں کے پاس سے میں نے گزرتے ہوئے سرسراہٹیں سنیں۔ یہ آوازیں بانس کے جھنڈ میں رہنے والے چوہے عام نکالتے ہیں جو میری آمد سے خبردار ہو کر چھپ جاتے تھے۔ پھر مجھے طویل سرسراہٹ سنائی دی جو شاید رسل وائپر ہوگا۔ اس سانپ کی عادت ہے کہ اپنا جسم گرم کرنے کی خاطر کنڈلی مار کر بیٹھتا ہے۔ پھر فائر لائن سے گزرنے والے ایک خرگوش پر آسمان سے کوئی بھاری چیز گری۔ یہ بڑا الو تھا جو خرگوش کی پیشانی پر اب مسلسل ٹھونگے مارتا جا رہا تھا۔ میں نزدیک پہنچا تو الو نے اپنے پر خرگوش کے گرد اس طرح پھیلا دیے جیسے وہ اسے بچا رہا ہو، ویسے ہی جیسے مرغی چوزوں کو بچاتی ہے۔ جب میں بہت قریب پہنچا تو الو اڑ گیا۔ میں نے لپک کر خرگوش کو اٹھایا اور اس کی کمر تھپکی۔ جونہی اسے ہوش آیا، اس نے لاتیں مارنا شروع کر دیں۔ میں نے اسے نرمی سے زمین پر رکھا اور وہ بھاگ کر اونچی گھاس میں گم ہو گیا۔

ان جنگلوں میں بھینسے نہیں ہوتے مگر ریچھ عام ملتے ہیں۔ جلد ہی ریچھ دکھائی دے گیا جو دیمک کھائے جا رہا تھا۔ درمیان میں وہ عجیب عجیب طرح کی بڑبڑاہٹ اور غراہٹ کی آوازیں نکالے جا رہا تھا۔ اس شور سے مجھے ریچھ کی موجودگی کا علم ہوا اور پھر دکھائی بھی دے گیا۔

یہاں میرے دائیں جانب دیمک کی بل تھی اور اس کے پاس کھڑے ہو کر ریچھ نے اس میں سوراخ کیا اور سر ڈال کر دیمک ہڑپ کرنا شروع کر دی۔ جب بھی بڑی مقدار میں دیمک نگلتا تو خوشی کی آواز آتی۔

ریچھ اتنا مصروف تھا کہ میں اس کے پاس سے گزر گیا مگر اسے میری موجودگی کا احساس تک نہ ہوا۔ دو گھنٹے تک میں اس فائر لائن پر چلتا رہا اور پھر واپس مڑا۔ ریچھ جا چکا تھا۔ فارسٹ بنگلے تک کچھ اور نہ دکھائی دیا۔

پھر میں نے شمالی فائر لائن کا رخ کیا اور ریل کی پٹڑی کی سمت چل پڑا۔ یہ فائر لائن سیدھی نہیں ہے بلکہ دائیں بائیں گھومتی جاتی ہے۔ تیسرے میل پر ایک ندی راستے میں پڑتی ہے جس میں صاف شفاف اور ٹھنڈا پانی چاندی کی طرح چمک رہا تھا۔

یہاں جھک کر میں نے بائیں ہاتھ کی اوک سے پانی پیا جبکہ دائیں ہاتھ میں رائفل تھامی ہوئی تھی۔ اس دوران میں نے پوری توجہ سے آس پاس کے جنگل کو دیکھا۔ تاہم نہ تو کچھ دکھائی دیا اور نہ ہی کچھ سنائی دیا۔ میں پھر چل پڑا۔

گارا اگلے موڑ پر بندھا ہوا تھا اور صحیح سلامت تھا۔ جب میں پاس سے گزرا تو اس نے مجھے عجیب سے انداز سے دیکھا کہ میں نے اسے کیوں یہاں باندھا ہوا ہے۔ میرے پاس اس کا جواب نہیں تھا، سو نظریں چراتے ہوئے میں چل پڑا۔

آخرکار میں پٹڑی پر پہنچا۔ یہاں فائر لائن رک جاتی ہے اور یہاں سے جنگلی جانوروں کی گزرگاہ شروع ہو کر سبزے میں گم ہو جاتی ہے۔ مزید آگے جانا خطرناک ہوتا۔ سو میں واپس مڑا۔

واپسی کے راستے پر مجھے ایک کوبراد کھائی دیا جو جنگلی چوہے کو نگل رہا تھا۔ تین چوتھائی چوہا اندر تھا اور پچھلے پیر اور دم لٹک رہی تھی۔ سانپ نے مجھے دیکھا تو اپنا پھن زمین سے دو فٹ اوپر اٹھا کر پھیلا دیا۔ پچھلی ٹانگیں اور دم اس کے منہ سے لٹک رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں چاندنی میں انگاروں کی مانند دہک رہی تھیں۔

یہاں رک کر میں نے نے زمین پر پیر مارے اور تالی بجائی۔ سانپ اچانک پریشان ہوا اور چوہے کو اگلنے کے بعد ایک طرف کی گھاس میں گم ہو گیا۔

ایک بار پھر میں بنگلے کو پہنچ گیا۔ پونے تین بج رہے تھے اور میں ل، بیس میل طے کر لیے تھے۔

اب دو فائر لائن بچ گئی تھیں مگر میرے پاس ایک کا وقت تھا۔ یا تو جنوب مشرق والی کا رخ کرتا جو ابھی تک میں نے نہیں دیکھی تھی یا پھر جنوب مغرب والی کا رخ کرتا جو ریلوے کی پٹڑی کو جاتی ہے اور وہاں پچھلی رات میں لاش پر بیٹھا تھا۔ بغیر کسی وجہ کے میں نے دوسری کا رخ کیا۔

میں ریلوے لائن تک پہنچا اور اسے عبور کر کے مزید آگے ایک میل مغرب کو گیا کہ اچانک شیرنی کی دھاڑ سے رات کا سناٹا ٹوٹ گیا۔ ایسا لگا کہ شیرنی مجھ سے محض دو فرلانگ آگے ہو۔ شاید شیرنی اسی فائر لائن پر ہی آ رہی ہو یا اس کا رخ مخالف سمت ہو۔

پچاس گز دوڑ کر میں ایک درخت کے پیچھے چھپا اور رائفل کو تیار کر کے تانا اور پھر نر شیر کی آواز نکالی۔

فوری جواب ملا اور اس بار یہ جواب محض سو گز دور سے آیا تھا۔ اب اگر میں دوبارہ بولتا تو اتنے قریب سے شیرنی کو احساس ہو جاتا کہ آواز نقلی ہے۔

بہت قریب سے شیر کی آواز نہیں نکالنی چاہیے کیونکہ اصلی شیر آواز کا فرق پہچان لیتا ہے۔ اگر شیر کو شک ہو جائے تو فرار ہو جاتا ہے۔ سو گز سے زیادہ دوری پر یہ آواز کام دیتی ہے۔ اگرچہ آدم خور شیر ہو یا ویسے فطری تجسّس، عین ممکن ہے کہ شیر پھر بھی آ جائے، مگر اس کو شک ہو جائے تو فرار بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے میں خاموش رہا۔

تیس سیکنڈ بعد شیرنی میرے سامنے فائر لائن پر آتی دکھائی دی۔ اس کی کھال چاندنی میں چمک رہی تھی۔ وہ میرے سامنے پہنچی اور پھر گزر گئی۔

میں نے کان کے پیچھے گولی چلائی۔ زمین پر گرتے ہوئے اس کی دم ایک بار ہلی۔ اسے علم بھی نہ ہو سکا کہ کیا ہوا ہے۔ انتہائی غیر شکاری انداز سے شیرنی ہلاک ہوئی۔

تاہم گزشتہ کئی سال سے ماموندر میں درندوں کے ہاتھوں کوئی انسانی ہلاکت نہیں ہوئی۔ یہ شیرنی نوجوان اور ہٹی کٹی تھی اور کوئی وجہ نہیں دکھائی دی کہ اس نے کیوں آدم خوری شروع کی۔ شاید چملا کے آدم خور نے اسے عادت ڈالی ہو۔

۴ گرہٹی کا پاگل ہاتھی

یہ ایک پاگل ہاتھی کی داستان ہے جسے مدراس کی حکومت نے سرکاری طور پر سالم کے کلکٹر اور ضلعی افسر برائے جنگلات کے ذریعے پاگل قرار دیا تھا۔

یہ واقعات بہت پہلے رونما ہوئے تھے۔ عام پاگل ہاتھیوں کی مانند اس ہاتھی کے پاگل ہونے کا سبب بھی معلوم نہیں ہو سکا۔ گرہٹی کے فارسٹ گارڈ کے مطابق اس ہاتھی کے پاگل ہونے سے ایک ماہ قبل رات کے وقت اس نے دو نر ہاتھیوں کی لڑائی کی آواز جنگل میں سنی تھی۔ اس کے مطابق لڑائی تین گھنٹے سے زیادہ جاری رہی اور فارسٹ بنگلے سے نصف میل دور چشمے پر ہوئی تھی۔

اگلے روز وہ جنگل گیا تو اس نے بہت زیادہ خون دیکھا۔ اس کے بیان کردہ واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لڑائی بہت بڑی تھی۔ شاید پاگل ہونے والا ہاتھی اس لڑائی میں شدید زخمی ہوا ہوگا اور پھر اس نے نسلِ انسانی سے انتقام لینا شروع کر دیا۔

ایک اور وجہ یہ بھی بیان کی جاتی تھی کہ شاید یہ مست ہاتھی ہوگا۔ ہر سال نر ہاتھی تین ماہ کے لیے مست ہوتے ہیں اور بہت خطرناک ہو جاتے ہیں۔

تیسرا امکان یہ ہے کہ ضلع سالم میں بہت سارے چور شکاری ہیں اور یہ ہاتھی ان میں سے کسی کی گولی کا نشانہ بنا ہوگا۔ یہ لوگ خشک موسم میں چشموں اور چاٹن (جہاں مٹی میں قدرتی طور پر نمک ملتا ہو) کے قریب چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں اور وہاں آنے والے ہر معصوم جانور کو بے دریغ ہلاک کرتے جاتے ہیں۔ شاید کسی چور شکاری نے غلطی سے یا گھبرا کر ہاتھی کو گولی ماری ہو اور زخمی ہاتھی پاگل ہو گیا ہو۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اپنی فصل کی حفاظت کرتے ہوئے کسی کسان نے اس پر توڑے دار بندوق سے گولی چلائی ہو۔ ہاتھی جنگل کے قریب کھیتوں میں سخت تباہی پھیلاتے ہیں۔

وجہ جو بھی رہی ہو، گرہٹی کا پاگل ہاتھی اچانک نمودار ہوااور تھوڑے ہی عرصے میں اس نے پورا جنگل بند کرکے دہشت پھیلا دی اور پیدل مسافراور بیل گاڑی پر سوار افراد چار سو مربع میل کے اس علاقے سے کترانے لگے۔

گرہٹی چھوٹی سی بستی ہے جس میں پانچ یا چھ گھر ہیں اور انچپٹی سے پنا گرام جانے والی سڑک سے دو میل دور وادی میں ہے۔ یہ جگہ ضلع سالم کے شمالی فارسٹ ڈویژن میں ہے۔ یہاں کا علاقہ پہاڑی ہے اور تلوادی کی ندی سے تین میل کے فاصلے تک بانس کے گھنے جنگل ہیں۔ اس مقام سے پندرہ میل آگے جا کر تلوادی ندی دریائے کاویری سے مل جاتی ہے۔ بانس کے جنگل میں ہمیشہ سے ہاتھی رہتے آئے ہیں اور اکثر تین چار تنہا ہاتھی بھی مل جاتے ہیں جو اگرچہ پاگل تو نہیں ہوتے، مگر ان کا سامنا کرنے سے عموماً گریز ہی کیا جاتا ہے۔

ایک اور ندی گولا موتھی کے نام سے ہے جو تلوادی کے متوازی اور اس سے بارہ میل شمال میں بہتی ہے اور آگے جا کر گنڈالم دریا سے ملتی ہے۔ یہ دریا مزید آگے کاویری سے مل جاتا ہے۔ یہ تین دریا اور یہاں کی پہاڑیاں اور بانس کے گھنے جنگل ہاتھیوں کی رہائش کے لیے بہترین مقام ہیں اور یہیں سے پاگل ہاتھی کی وارداتوں کا آغاز ہوا۔

ابتدا کچھ ایسے ہوئی۔ گرمیوں کے وسط میں گولا موتی کی ندی خشک ہو گئ اور کہیں کہیں پانی کے چھوٹے چھوٹے تالاب سے بچ گئے جو دریا کی تہہ میں اور پتھروں سے گھرے ہوئے ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک تالاب میں کچھ مچھلیاں بھی جمع ہو گئ تھیں جو چھ سے آٹھ انچ لمبی تھیں۔ ایک

روز سہ پہر کے وقت پانچ میل دور انجٹی سے دو بندے اس خشک ہوتے ہوئے تالاب میں جال ڈال کر مچھلیاں پکڑنے آئے۔

تالاب پر پہنچ کر انہوں نے جال لگایا۔ جلد ہی کافی مچھلیاں پکڑ لیں۔ پھر مچھلیاں ٹوکریوں میں ڈال کر وہ ایک درخت کے نیچے قیلولہ کرنے سو گئے۔

پانچ بجے ان میں سے ایک کی آنکھ کھلی۔ سورج تالاب کے مغرب والی پہاڑی کے پیچھے چھپ گیا تھا مگر روشنی خاصی تھی۔ جب وہ بیٹھا تو پیچھے سے کوئی آواز سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا کہ گولا موتی کے جنوبی کنارے سے ہاتھی اتر کر ان کی سمت آ رہا تھا۔

اس بندے نے اپنے ساتھی کو جھنجھوڑا اور تامل میں چیخا: 'انائی وارا دھو' جس کا مطلب تھا کہ ہاتھی آ رہا ہے۔ پھر وہ بندہ شمالی کنارے کے جنگل کو بھاگ گیا۔ اس کا ساتھی اچانک نیند سے بیدار ہوا تو اسے کچھ سمجھ نہ آیا اور حیرت سے اپنے ساتھی کو جاتے دیکھتا رہا۔ اتنے میں ہاتھی سر پر آ گیا۔

فرار ہونے والا بندہ اپنے پیچھے ساتھی کی چیخیں سنتا رہا جو ہاتھی کی چنگھاڑ کے ساتھ آ رہی تھیں۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ ظاہر ہے کہ اس نے رک کر صورتحال جاننے کی کوشش نہیں کی۔ دو روز بعد انجٹی سے ایک جماعت اس بندے کی باقیات کو اٹھانے آئی جو گوشت اور ہڈیوں کے ملغوبے کی شکل میں تھا۔ پہلے ہاتھی نے اس پر اپنا پیر رکھا اور پھر سونڈ کی مدد سے اس کے اعضا اکھاڑ دیے۔ پھر اس کی ایک ٹانگ دس گز دور لے جا کر جامن کے درخت سے ٹکرائی اور دور پھینک دی۔

اس پاگل ہاتھی کا یہ پہلا شکار تھا دوسری مرتبہ۔ اس نے ایک لڑکے پر حملہ کیا جو اپنے مویشیوں کو گنڈالم لے جا رہا تھا۔ یہ لڑکا نوجوان اور پھرتیلا ہونے کی وجہ سے ندی کی ریت پر بھاگا اور ہاتھی پیچھے

پیچھے تھا۔ جب اس نے ہاتھی کو قریب آتے دیکھا تو وہ پہاڑی کے کنارے پر چڑھ گیا جو کافی ڈھلوان تھا اور وہاں چھوٹے چھوٹے گول پتھر بکثرت تھے۔ یہاں اسے دور نکلنے کا موقع مل گیا۔

دیوانہ وار بھاگتے ہوئے اس بیچارے کے پیروں کے تلوے لیر لیر ہو گئے اور جسم پر جگہ جگہ کانٹوں سے زخمی ہو گیا۔ تاہم اس نے دوڑ جاری رکھی اور آخر کار اونچی چٹان پر چڑھ گیا جو پہاڑی پر دو سو گز کی بلندی سے شروع ہوتی تھی۔

بعد میں اس نے بتایا کہ ہاتھی اس چٹان تک پہنچ گیا تھا اور چٹان کے گرد کئی بار چکر بھی لگایا اور اپنی سونڈ سے اسے پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ تاہم اس لڑکے نے سمجھداری سے کام لیا اور مسلسل حرکت کرتا ہوا ہاتھی سے دور رہا۔ یہاں چٹان کا کل رقبہ پچیس مربع فٹ تھا اور کئی بار ہاتھی کی سونڈ اس کے پیر سے ایک فٹ دور رہ گئی تھی۔ ایک گھنٹہ کوشش کے بعد ہاتھی اچانک مڑا اور چلا گیا۔ تاہم یہ لڑکا اتنا پریشان تھا کہ اس نے ساری رات وہیں گزاری اور اگلی صبح جب سورج خاصا چڑھ آیا تھا تو وہ تسلی کر کے اترا۔

اس کے بعد ایک ماہ گزر گیا اور مقامی لوگ یہ سوچنے لگے کہ شاید ہاتھی کہیں اور نکل گیا ہوگا یا پھر مست والی حالت ختم ہو گئی ہو گی۔

تاہم ان کی امیدیں نہ بر آئیں۔ لڑکے والے واقعے کے ٹھیک سوا مہینے بعد پاگل ہاتھی نے نترا پالم کو پیدل جانے والے دو مسافروں کا پیچھا کیا۔ یہ بستی انچٹی سے آٹھ میل جنوب میں ہے۔ ان بندوں نے اچانک دیکھا کہ سو گز دور ہاتھی ان کے پیچھے بھاگا آ رہا ہے۔ ایک آدمی تیس اور دوسرا چالیس سال کا تھا۔ بڑی عمر کا آدمی جلدی تھک گیا اور اس کا سانس چڑھ گیا۔ اسے علم تھا کہ اس کے پیچھے خوفناک موت آ رہی ہے سو اس نے ہمت نہیں ہاری۔ بد قسمتی سے اس بندے کی عقل کام

چھوڑ گئی تھی ورنہ چاہتا تو کسی درخت پر چڑھ جاتا، کسی چٹان کے پیچھے چھپ جاتا یا اپنے کپڑے کا کوئی حصہ اتار کر پھینک دیتا۔ اتار کر پھینکے گئے کپڑے سے اسے کم از کم چند منٹ کا اضافی وقت مل جاتا۔ جب بھی ہاتھی پیچھے لگا ہو تو آخری چارے کے طور پر کپڑے اتار کر پھینکے چاہیں کہ جب ہاتھی کپڑوں کے پاس پہنچتا ہے تو ان میں سے انسانی بو آتی ہے اور ہاتھی انہیں پھاڑنے کے لیے رک جاتا ہے۔ اس طرح شکار کو فرار ہونے کا موقع مل جاتا ہے۔

تاہم جب تک ہمت رہی، یہ بندہ بھاگتا رہا اور جب گرا تو ہاتھی سر پر پہنچ گیا۔ ہاتھی نے اسے اٹھا کر ساتھ پڑے بڑے پتھر سے ٹکرا ٹکرا کر اس کا قیمہ بنا دیا اور پھر پھینک کر جنگل میں گم ہو گیا۔

ان واقعات کی وجہ سے محکمہ جنگلات کو عرضیاں بھیجی گئیں کہ اس ہاتھی کو پاگل قرار دیا جائے تاکہ اس ضلع کے تمام شکاریوں کو ہاتھی کے شکار کی عام اجازت مل جائے۔ عام طور پر ہندوستان میں ہاتھیوں کو بچانے کی پوری کوشش کی جاتی ہے۔ سرخ فیتے کی وجہ سے منظوری میں تین ماہ گزر گئے۔ پھر ایک ماہ کا وقفہ گزرا جس میں ضلع کے تمام لائسنس یافتہ شکاریوں کو اطلاع بھیجی گئی۔

اس دوران ہاتھی نچلا نہیں بیٹھا۔ اس نے صندل کی لکڑی سے لدی ایک بیل گاڑی پر حملہ کیا۔ گاڑی بان اور فارسٹ گارڈ جو ہمراہ تھے، جنگل میں چھپ کر اپنی جان بچا سکے۔ تاہم گاڑی کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور بیل بھی معمولی زخمی ہوئے۔

کچھ دن گزرے کہ ہاتھی نے عجیب کام کیا۔ عموماً چرواہے جب مویشی چراتے ہیں تو وہ کافی رقبے پر پھیل جاتے ہیں۔ شاید ایک جانور ہاتھی کے بہت قریب چلا گیا اور ہاتھی نے اس پر حملہ کر کے اس کی کمر توڑ دی۔

پھر کچھ دن خاموشی سے گزرے کہ خبر آئی کہ ہاتھی نے ایک پجاری کو ہلاک کر دیا ہے۔ پجاری قبیلے کے لوگ اس علاقے میں رہتے تھے۔ یہ بندہ ایک ٹھیکدار کے لیے شہد جمع کر کے آ رہا تھا جس کے پاس جنگل کے اس حصے سے شہد جمع کرنے کا ٹھیکہ تھا۔

پھر سرکاری اطلاع میرے پاس پہنچی۔ اصولی طور پر مجھے ہاتھی کا شکار کرنے میں کوئی لطف نہیں آتا کہ مجھے ہاتھی پسند ہیں۔ دوسرا یہ بھی کہ اس میں خطرے کا عنصر نہیں ہے کیونکہ ہاتھی بہت بڑا جانور ہے اور جب یہ پیٹ بھر رہے ہوں تو ان کی آواز دور سے سنائی دے جاتی ہے۔ پھر محض ہوا کے رخ کا خیال رکھتے ہوئے مخالف سمت سے جا کر قریب پہنچ کر گولی چلا دینا کافی رہتا ہے۔ اس لیے محض اتنا تجربہ کافی ہے کہ پیر رکھتے ہوئے کیسے احتیاط کرنی چاہیے تاکہ کوئی ٹہنی یا خشک پتے نہ آواز پیدا کریں۔

شکار کا ایک اور اہم اصول بوقتِ ضرورت ساکت ہونا ہے۔ چاہے آپ جس بھی حالت میں ہوں، جب کوئی جانور آپ کی سمت دیکھے تو آپ اسی حالت میں تھم جائیں۔ بعض حالتیں ایسی ہوتی ہیں کہ رکنا مشکل ہوتا ہے مگر اس وقت ہلکی سی حرکت بھی آپ کا بھانڈا پھوڑ سکتی ہے۔ ایک ہی حالت میں دس منٹ تک ساکت رہنے کی صلاحیت بہت فائدہ مند ہوتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ بعض اوقات یہ بہت تھکا دیتی ہے۔

ان طریقوں پر عمل کرتے ہوئے میں ہاتھیوں سے محض چند گز کے فاصلے تک پہنچ جاتا ہوں اور انہیں سکون سے پیٹ بھرتے دیکھتا ہوں اور انہیں میری خبر تک نہیں ہوتی۔ مگر میری بو کا ہلکا سا جھونکا یا معمولی سی آواز بھی انہیں بھاگنے پر مجبور کر سکتی ہے۔ ہاتھی کی نگاہ انتہائی کمزور ہوتی ہے

اور اگر آپ خاکی سبز کپڑے پہنے ہوئے ہوں اور بالکل ساکت ہوں تو آپ کی طرف دیکھنے کے باوجود بھی ہاتھی آپ کو نہیں دیکھ سکے گا۔

انہی وجوہات کی بنا پر میں ہاتھیوں پر گولی چلانے کے خلاف ہوں۔ ویسے بھی بہت سارے پاگل ہاتھی حقیقت میں پاگل نہیں ہوتے۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، چور شکاری اور زمیندار اکثر ہاتھیوں پر گولی چلا کر انہیں زخمی کر دیتے ہیں اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہاتھی انسان سے نفرت کرنے لگ جاتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بہت سارے واقعات جو پاگل ہاتھیوں سے منسوب کیے جاتے ہیں، حقیقت میں کوئی وجود نہیں رکھتے اور لوگ ان کے شکار کے لیے ایسے واقعات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں تاکہ شکار کی اجازت مل جائے۔ عموماً کلکٹر ان واقعات کی پوری طرح چھان بین کرتے ہیں اور پھر احکامات جاری کرتے ہیں مگر بعض اوقات غلط ہاتھی بھی مارے جاتے ہیں۔

سو میں نے سرکاری اطلاع پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ مگر تین ہفتے بعد مجھے پنا گرام میں رہنے والے اپنے شکاری رنگا کا خط ملا۔ اس نے لکھا کہ چار روز قبل اس ہاتھی نے ایک پجاری عورت کو انائی بدھامدھوو نامی جگہ پر ہلاک کیا ہے۔ یہ جگہ گرہٹی سے سات میل دور ہے۔ اس جگہ کے نام کا ترجمہ 'وہ تالاب جہاں ہاتھی گرا' بنتا ہے۔ یہ قدرتی تالاب ہے جس کے کنارے پتھریلے ہیں اور اس میں انائی بدھالا نامی دریا کا پانی گرتا ہے۔ یہ دریا چنار کی ایک شاخ ہے جو بذاتِ خود کاویری کی شاخ ہے۔ کاویری جنوبی ہندوستان کا سب سے بڑا دریا ہے۔ مزید یہ کہ یہ تالاب بہت گہرا ہے اور کبھی خشک نہیں ہوا۔ بتایا گیا کہ بہت برس گزرے، ایک ہاتھی اس تالاب سے پانی پینے آیا اور پیر پھسلنے کے سبب تالاب میں جا گرا۔ چونکہ تالاب کے کنارے پتھریلے اور پھسلواں تھے، اس لیے

ہاتھی باہر نہ نکل سکا۔ ہاتھی بہت اچھے تیراک ہوتے ہیں اور ان کی ہمت اور طاقت کا بھی جوڑ نہیں، مگر ان کی جسامت بہت بھاری ہوتی ہے اور یہ ہاتھی بیچارہ تین دن مسلسل تیرنے کے بعد آہستہ آہستہ ڈوب گیا۔ اس دوران گیارہ میل دور پِنا گرام سے بہت سارے لوگ جمع ہو کر یہ 'تماشا' دیکھتے رہے۔

رنگا کا خط ملنے کے بعد، اور چونکہ رنگا سے ملے بہت عرصہ ہو گیا تھا، سو میں نے چار روز کی چھٹی لی اور پِنا گرام کو چل پڑا۔ راستے میں رنگا کو اٹھایا اور گرہٹی کے فارسٹ بنگلے کو چل پڑا۔ وہاں جانے والے راستے کے آخری اٹھارہ میل سڑک انتہائی خراب تھی۔ راستے میں ہم اس تالاب سے بھی گزرے۔

گرہٹی کے فارسٹ گارڈ نے ہاتھی کی موجودگی کے بارے بتایا اور یہ بھی کہ اس علاقے میں دس ہاتھیوں کا غول بھی موجود ہے۔ یہ سب ہاتھی بنگلے کے سامنے والے تالاب سے پانی پیتے تھے۔ اس غول میں کئی ہاتھی پاگل ہاتھی کی جسامت کے تھے، سو ان میں فرق کرنا دشوار تھا۔ اس لیے ہمیں پگوں کا پیچھا کرنے میں کافی مشکل پیش آتی۔

مزید برآں ہاتھی کی بتائی گئی تفصیل بھی کافی مبہم تھی اور یہ بتایا گیا کہ اس کے اگلے پیر کی گولائی چار فٹ دس انچ ہے جس سے پتہ چلتا تھا کہ ہاتھی لگ بھگ نو فٹ آٹھ انچ اونچا ہو گا کیونکہ اگلے پیر کی گولائی کو دو سے ضرب دیں تو اونچائی بنتی ہے۔ ہاتھی کا رنگ سیاہ بتایا گیا تھا مگر نہانے کے بعد ہر ہاتھی سیاہ نکل آتا ہے۔ مگر ہاتھی مٹی میں لوٹ لگاتے ہیں تو ان کا رنگ بھی مٹی کی مناسبت سے بدلتا رہتا ہے۔ یہ بھی کوئی اہم نشانی نہیں تھی۔ البتہ ایک چیز اہم تھی کہ بتایا گیا تھا کہ اس ہاتھی کے بیرونی دانت تین فٹ سے زیادہ طویل اور سرے پر ایک دوسرے کو قطع کرتے تھے۔

آپ نے درست اندازہ لگایا کہ محض آخری نشانی ایسی تھی کہ میں ہاتھی کی تلاش میں استعمال کر سکتا تھا۔ تاہم اس لیے مجھے ہاتھی کو عین سامنے سے دیکھنا پڑتا کہ اطراف سے مغالطہ ہو سکتا تھا۔ غلط ہاتھی کا شکار کرتا تو نہ صرف مجھے افسوس ہوتا بلکہ سرکاری طور پر مجھے کافی مشکلات پیش آتیں۔

ایک طریقہ تو یہ تھا کہ میں تالاب پر جا کر ہر ہاتھی کے قدموں کے نشانات ماپتا اور مطلوبہ حجم والے نشانات کا تعاقب کر کے ہاتھی کے دانت دیکھتا اور اگر اس کے دانت سروں پر ایک دوسرے کو قطع کر رہے ہوتے تو وہی میرا مطلوبہ ہاتھی ہوتا۔ اگر دانتوں کے سرے پر فاصلہ ہوتا تو اس ہاتھی کو چھوڑ کر واپس تالاب پر آتا اور اسی طرح دوسرے ہاتھی کا تعاقب کرتا۔ یاد رہے کہ میرے پاس کل چار روز تھے اور ان میں سے ایک دن رنگا کو اٹھانے، گرہٹی آنے اور تحقیق کرنے میں صرف ہو گیا تھا۔

رات کو دس بجے مجھے ہاتھیوں کے غول کی آواز تالاب کی سمت سے آئی۔ ظاہر ہے کہ یہ میرے مطلوبہ ہاتھی نہیں تھے۔ سو میں دوبارہ سو گیا۔

صبح پو پھٹتے ہی میں اٹھا اور رنگا اور فارسٹ گارڈ کو اپنے منصوبے کے بارے بتایا۔ تالاب کے کنارے پر مٹی بھر بھری ہو چکی تھی اور ہر عمر کے ہاتھی کے پیروں کے نشانات موجود تھے۔

تالاب کے گرد چکر لگایا تو مجھے مطلوبہ جسامت کے تین ہاتھیوں کے نشان ملے۔ ان میں سے دو تالاب کے اسی جانب تھے جہاں سے غول نے پانی پیا تھا۔ تیسرا ہاتھی دوسری جانب سے آیا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہی ہاتھی ہمارا مطلوبہ ہو گا۔ سو ہم نے ان کے تعاقب کا فیصلہ کر لیا۔ رنگا آگے چل رہا تھا۔ میرے پاس اعشاریہ ۴۵۰/۴۰۰ بور کی دو نالی جیفریز رائفل تھی جبکہ میرے پیچھے

فارسٹ گارڈ عقب کی نگرانی کرتا آ رہا تھا کہ کہیں ہاتھی چکر کاٹ کر اب ہمارے پیچھے نہ اپنا پیٹ بھر رہا ہو۔

تالاب سے کچھ دور تک لمبی تیز دھار گھاس موجود تھی جہاں ہاتھیوں کے گزرنے کی وجہ سے راستے سے بنے ہوئے تھے۔ پھر خاردار جھاڑیاں اور بیلیں شروع ہوئیں۔ یہاں بھی ہاتھی کی گزرگاہ صاف دکھائی دے رہی تھی مگر چلتے ہوئے کانٹے بار بار ہمارے کپڑوں میں اٹک جاتے۔

تاہم نشانات واضح تھے اور ہم نے کچھ ہی وقت میں ایک میل کا سفر کر لیا اور ایک چھوٹی پہاڑی کے نیچے جا پہنچے۔ اس پہاڑی کی ڈھلوانیں بانس کے گھنے جنگل سے بھری ہوئی تھیں اور ہاتھی ان سے گزر کر اوپر کو گیا تھا۔ یہاں کئی جگہ رک کر اس نے بانس کی نرم کونپلوں سے پیٹ بھرا تھا اور جگہ جگہ گرے ہوئے بانس اس کا ثبوت تھے۔ ہاتھی کا بہت سارا گوبر بھی یہاں پڑا تھا اور چوٹی سے ہو کر ہم نیچے اترے تو ظاہر تھا کہ ہاتھی یہاں صبح سویرے کئی گھنٹے تک اپنا پیٹ بھرتا رہا تھا کہ یہاں موجود ہاتھی کا گوبر ابھی نیم گرم تھا۔

یہاں سے آگے بڑھنا کافی دشوار ہو گیا۔ ہر سمت بانس کا گھنا جنگل تھا اور ذرا سی بھی بے احتیاطی سے شور ہوتا اور ہاتھی بھاگ جاتا۔

میں نے رنگا کے بازو کو چھو کر اسے ساکت ہونے کا اشارہ کیا اور خود بھی ٹھہر گیا۔ دس منٹ تک ہم نے ہاتھی کے پیٹ بھرنے کی آواز سننے کی کوشش کی جو خوراک ہضم کرتے ہوئے ہاتھی نکالتا ہے۔ مگر جنگل نسبتاً خاموش تھا اور جنگلی مرغوں کی آوازیں ہر سمت سے آ رہی تھیں اور سامنے والی پہاڑی پر لنگور شور کر رہے تھے۔

بظاہر ہاتھی کہیں آرام کر رہا ہوگا یا پھر نیچے وادی میں چلا گیا ہوگا۔ اس لیے ہم نے احتیاط سے پیش قدمی جاری رکھی۔ ہمیں مسلسل نیچے بھی دیکھنا پڑتا تھا کہ ہم چلتے ہوئے کوئی شور نہ کریں۔ نصف میل کے مزید سفر کے بعد ہم وادی میں پہنچ گئے جہاں جھاڑیاں بہت زیادہ تھیں۔ ان میں جنگلی آلو بخارے، کھڑ بیل اور املی کے درخت بھی بکثرت تھے اور پندرہ یا بیس گز سے زیادہ دور کچھ نہیں دکھائی دیتا تھا۔ اگلے دو سو گز کے بعد ہم گولا موٹھی دریا کو جانے والی ایک ندی کی پتھریلی گزرگاہ پر پہنچ گئے۔

یہاں ہاتھی مڑا اور پچاس گز دور ریتلے قطعے سے ہو کر گزرا۔ دوسرے کنارے پر جہاں ہاتھی چڑھا، کافی ڈھلوان تھا۔ اس پر چڑھتے ہوئے خطرہ تھا کہ سامنے کہیں پاگل ہاتھی نہ آ جائے۔

ہر ممکن طریقے سے ہم بہت آہستگی اور خاموشی سے آگے بڑھنے لگے۔ ہاتھی اب پھر چل پڑا تھا۔ جلد ہی ہم نے جان لیا کہ وہ پہاڑی کی دوسری جانب والی وادی کی طرف جا رہا ہے۔ یہ سوچ کر ہم نے اپنی رفتار بڑھا دی مگر چوتھائی میل دور گئے ہوں گے کہ ہمیں ہاتھی کے نظامِ انہضام سے نکلنے والی آوازیں آنے لگیں۔

میں نے رنگا اور فارسٹ گارڈ کو املی کے مضبوط اور تناور درخت پر چڑھا دیا اور خود اکیلا اس جانب بڑھا۔ ہاتھی ایک نشیب میں تھا جہاں بانس کا گھنا جنگل تھا۔ بظاہر وہ آرام کر رہا تھا یا شاید لیٹا ہوا ہو کیونکہ اس کی چرنے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ تاہم اب ہاضمے کے دوران نکلنے والی آوازیں بھی بند ہو گئی تھیں۔

بہت احتیاط سے میں قدم بقدم نشیب میں داخل ہوا۔ پھر جھک کر میں نے مٹی اٹھائی اور گرا کر ہوا کا رخ جانچا۔ مٹی تقریباً سیدھی گری یعنی ہوا نہیں چل رہی تھی۔ یہ مسئلہ ہو سکتا تھا کہ تھمی ہوئی ہوا میں ہاتھی میری بو سونگھ لیتا۔

اس طرح مزید محتاط ہو کر میں آگے بڑھا۔ بانس میرے اوپر چھائے ہوئے تھے اور ہر جھنڈ کے پاس پہنچنے سے قبل اس کا بغور جائزہ لیتا۔ چند گز آگے جا کر مجھے اپنے سامنے سلیٹی رنگ کا ایک تودہ دکھائی دیا۔ یہ ہاتھی تھا جو زمین پر لیٹا ہوا تھا۔ بدقسمتی سے اس کا رخ مخالف جانب تھا۔

اب دو ہی راستے تھے: یا تو میں چکر کاٹ کر دوسری جانب جاتا اور ہاتھی کے دانت دیکھتا یا پھر اسے بیدار کرتا۔ ظاہر ہے کہ بیدار ہوتے ہی ہاتھی میری جانب رخ کرتا۔ سو اسے ہلاک کرنے سے قبل میں تسلی کر لیتا۔

دوسرے طریقے کو آسان سمجھتے ہوئے میں بانس کے ایک جھنڈ کے پیچھے جزوی طور پر چھپا اور سیٹی بجائی۔ ہاتھی نے حرکت نہ کی۔ شاید وہ گہری نیند سو رہا تھا یا پھر اس نے سوچا کہ کوئی پرندہ بولا ہوگا۔ پھر میں نے ٹک ٹک کی آواز نکالی۔ ہاتھی فوراً بیدار ہوا اور میری جانب مڑا۔

بہت بڑا ہاتھی تھا۔ کم از کم دس فٹ اونچا ہوگا اور اس کے خوبصورت دانت صبح سویرے دھوپ میں چمک رہے تھے۔ تاہم ان کا درمیانی فاصلہ زیادہ تھا۔ ہم نے غلط ہاتھی کا پیچھا کیا تھا۔

نصف منٹ تک ہاتھی مجھے حیرت سے دیکھتا رہا اور اس کی ننھی آنکھیں نیند کے خمار سے بوجھل تھیں۔ میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہوگا۔ حیرت کے بعد اس کا دوسرا تاثر ناراضگی تھا جس کے اظہار کے لیے وہ چنگھاڑا اور میری جانب ایک دو قدم بڑھا۔ میں نے ایک بار سیٹی بجائی اور ہاتھی مڑ کر جنگل میں غائب ہو گیا۔

جب میں واپس رنگا اور فارسٹ گارڈ کے پاس پہنچا تو وہ صورتحال کا اندازہ کر کے املی کے درخت سے اتر آئے تھے۔ پھر ہم تینوں مایوسی کے مارے واپس تالاب کو لوٹے۔ غصہ الگ تھا۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، دو اور ہاتھیوں کے پیروں کے نشان بھی اس جیسے تھے۔ مگر یہ نشان کیچڑ پر تھے، سو ان کی درست پیمائش کارِ دارد تھا کہ کیچڑ میں نشان اصل سے بڑا بنتا ہے۔ رنگا نے ایک کا پیچھا کیا جبکہ میں اور فارسٹ گارڈ دوسرے ہاتھی کے پیچھے گئے اور طے کیا کہ پندرہ منٹ کے بعد واپس یہیں لوٹ کر بات کریں گے۔

کچھ دور جانے پر پتہ چل گیا کہ یہ ہاتھی غول کے ساتھ گیا تھا اور عام ہاتھی تھا کہ جنگل میں ہتھنیوں اور بچوں کے پیٹ بھرنے کے نشانات ملے تھے۔ یہ ہاتھی پاگل نہیں ہو سکتا، سو پندرہ منٹ بعد میں واپس لوٹا۔ رنگا کے پاس چونکہ گھڑی نہیں تھی، سو وہ ابھی واپس نہیں آیا تھا۔ زمین پر بیٹھ کر میں نے پائپ اور چائے پی، فارسٹ گارڈ تھرماس اٹھائے ہوئے تھا۔ مزید دس منٹ بعد رنگا واپس آیا اور بولا کہ وہ چوتھائی میل گیا تھا اور یہ ہاتھی چکر کاٹ کر بنگلے کے پیچھے اور دیگر ہاتھیوں کے عین مخالف سمت گیا تھا۔

یہ خبر امید افزا تھی۔ ہم فوراً روانہ ہو گئے۔ جلد ہی ہم اس مقام پر پہنچ گئے۔ یہاں پہنچ کر یقین ہو گیا کہ یہ ہاتھی مسافر ہے کیونکہ وہ پیٹ بھرنے کے لیے کہیں نہیں رکا تھا، بس کہیں کہیں سونڈ سے کونپلیں نوچتا گیا تھا۔ یہ ہاتھی سیدھا چلتا ہوا فارسٹ بنگلے کے پیچھے والے جنگل میں دو پہاڑیوں سے گزرا۔ اس کا رخ براہ راست تلوادی کی ندی کی طرف تھا۔

اس ندی تک پہنچنے میں ہم چار میل کا سفر کرنا پڑا اور یہاں ہاتھی جنوب مغرب کو مڑ گیا تھا اور دریائے تلوادی میں ہی سفر کر رہا تھا۔ مجھے علم تھا کہ دریائے کاویری اس جگہ سے پندرہ میل دور

ہے، سو مجھے لگا کہ ہاتھی نے اچانک کاویری کا رخ کر لیا ہے۔ اگر وہ ایسا کرتا تو دریا کو تیر کر عبور کرتا اور دوسرے کنارے پر پہنچ کر گم ہو جاتا کہ وہاں نہ صرف جنگل بہت گھنا ہے بلکہ وہاں کا علاقہ پہاڑی بھی ہے اور نیلگری اور بلیگیری رنگن تک سو میل تک مسلسل جنگل ہی جنگل ہے۔

ہم لوگ ہر ممکن تیزی سے بڑھے اور ہوا کا رخ دیکھتے ہوئے ہاتھی کا پیچھا کئی گھنٹوں تک جاری رکھا۔ ہاتھی کے قدموں کی طوالت سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کسی خاص مقام کا سوچ کر جا رہا ہے۔

دریا کی نرم ریت اب دوپہر کے سورج میں انگاروں کی طرح دہک رہی تھی۔ مجھے چلنے میں دقت ہو رہی تھی۔ وقفے وقفے سے دریا کی تہہ پتھریلی ہو جاتی اور گول مٹول پتھر دکھائی دیتے۔ ایسی جگہوں پر ہاتھی کناروں کی جانب ہو کر چلتا رہا تاکہ پتھروں سے بچ سکے۔ ہم نے اس کی پیروی کی اور تیزی سے اپنا راستہ بناتے چلے گئے۔ پسینے سے ہمارا حال برا تھا۔

پندرہ میل کے سفر کے بعد ہم تلوادی اور کاویری کے سنگم پر آن پہنچے۔ دریا سے چند سو گز قبل تلوادی کی ندی اتائی ملائی نامی دیہات والے راستے سے گزری۔ یہاں ہاتھی نے اپنا رخ بدل کر اتائی ملائی کو دو میل تک گیا تھا اور پھر دوبارہ جنوب کو مڑ کر دریا کے کنارے دلدل کی سمت چل پڑا۔ اس دلدل کو کرتی پالم کہا جاتا تھا یعنی بھینسے والی دلدل، جسے میں خوب پہچانتا تھا۔ بہت سال قبل یہ جگہ بھینسوں کا پسندیدہ مقام تھی۔ اس موسم میں دلدل خشک ہو چکی تھی اور کہیں کہیں زمین نرم تھی۔ تاہم گھنی گھاس ہر جگہ اگی ہوئی تھی اور درختوں کے جھنڈ بھی کئی جگہوں پر موجود تھے۔

تاہم یہاں ہاتھی کے پیٹ بھرنے کی علامات دکھائی دیں اور ہمیں ہاتھی کا گوبر دکھائی دیا جو زیادہ پرانا نہیں تھا۔

یہاں سے کیچڑ شروع ہو گیا تھا، سو میں نے رنگا اور فارسٹ گارڈ کو واپس بھیج دیا تاکہ کم سے کم آواز پیدا ہو۔ پیش قدمی بہت سست تھی کیونکہ مجھے نہ صرف ہاتھی کا بھی خیال رکھنا تھا بلکہ زمین پر بھی دیکھ بھال کر قدم رکھنا تھا کہ کہیں دلدل نہ شروع ہو جائے۔ کئی بار میں گھٹنوں تک دلدل میں دھنس گیا مگر پھر خود کو نکال لیتا تھا اور کوشش ہوتی تھی کہ آواز نہ نکلے۔

کئی مرتبہ رک کر میں نے آواز سننے کی کوشش کی مگر کچھ سنائی نہ دیا۔ پھر اچانک بڑی گھاس میں سرسراہٹ سنائی دی اور ہاتھی بیس گز دور کھڑا تھا۔ ابھی ابھی وہ کیچڑ سے اٹھا تھا اور سارے بدن سے کیچڑ ٹپک رہا تھا۔ یہ بڑا نر ہاتھی تھا اور اس کے بیرونی دانت چمک رہے تھے اور ان کا خم خوبصورت تھا۔ تاہم یہ مطلوبہ ہاتھی نہ تھا۔ مجھے اتنی مایوسی ہوئی کہ میں نے آواز کر کے ہاتھی کو بھگا دیا اور پھر واپس اپنے ساتھیوں کی طرف لوٹا۔ انہیں بھی پتہ چل چکا تھا کہ میرا مزاج برہم ہے۔

چار بج چکے تھے اور ابھی ہمیں پندرہ میل تلوادی کے ساتھ اور پھر چار میل مزید گرہٹی کے بنگلے کا سفر رہتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ہم بیلی گنڈلو میں رات گزار کر واپس جاتے مگر اس طرح اگلا روز آدھا تو واپسی پر ضائع ہو جاتا جبکہ میرے پاس کل دو روز بچے تھے۔ سو میں نے واپسی کا حکم دیا۔ میرے ساتھیوں نے اس پر احتجاج کیا کہ عنقریب سورج غروب ہو جائے گا اور چاند بھی نہیں اور نہ ہی ٹارچ، تو باقی کا سفر گہرے اندھیرے میں کرنا پرخطر ہوگا۔ کیا پتہ ہاتھی کا سامنا ہو جائے۔ میں نے کہا چاہے ایک ہاتھی ہو یا ہزار، میں ان سب کو جہنم رسید کرنے کو تیار ہوں۔

واپسی کا سفر بہت تھکا دینے والا اور دشوار تھا۔ جگہ جگہ ہم پتھروں اور زمین سے نکلی ہوئی جڑوں سے ٹھوکریں کھاتے اور بیلوں سے الجھتے ہوئے گئے مگر ہاتھی کا کوئی اتہ پتہ نہیں تھا۔ لگ بھگ

نصف شب کے قریب ہم گرہٹی کے بنگلے پہنچے اور تھکن سے نڈھال تھے۔ ہم لوگ پو پھٹتے نکلے تھے اور مسلسل چلتے ہوئے دریاؤں، دلدلوں، نہروں، کانٹوں اور جنگلوں میں سفر کرتے رہے اور چالیس میل طے کیے۔ بھوک اور پیاس سے برا حال تھا۔

اگلی صبح جسم درد سے ٹوٹ رہا تھا اور پیر سوجے ہوئے تھے۔ فارسٹ گارڈ کا ٹخنہ سوجا ہوا تھا جو تلوادی کے دریا میں کہیں مُڑ گیا تھا۔ اس نے تو معذرت کر لی۔ رنگا البتہ ٹھیک تھا اور تیار بھی۔ دلیہ، بیکن اور انڈوں کے ساتھ تیز کافی سے میں تازہ دم ہو گیا جبکہ راگی کو ابال کر ایک گیند بنا کر کافی کے ساتھ کھا کر رنگا بھی سارے دن کے لیے تیار تھا۔

پچھلی رات ہم اتنے تھکے ہوئے تھے کہ ہمیں کوئی آواز نہ سنائی دی تھی مگر اب تالاب پر جا کر دیکھا کہ ہاتھیوں کا غول رات کو پانی پینے آیا تھا۔ اس کے علاوہ دو بڑے نر ہاتھیوں کے پیروں کے نشان بھی واضح تھے۔ ان میں سے ایک تو شاید وہی تھا جس کا میں پیچھا کرتا رہا تھا مگر دوسرے کا پیچھا نہیں کیا تھا۔ تیسرے نر کے بارے علم تھا کہ وہ یہاں سے دور نکل گیا ہے۔

پھر بھی ہمارے پاس زیادہ کچھ کرنے کو نہیں تھا۔ سو ہم نے ایک ہاتھی کا پیچھا کیا اور اس تک جا پہنچے۔ ساڑھے نو بجے ہمیں وہ دکھائی دیا۔ یہ پچھلے دو نروں کی نسبت چھوٹا تھا۔ تاہم یہ ہاتھی بھی پاگل نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ کل والے تین نروں میں یہ تیسرا تھا۔ تالاب کو واپس لوٹے اور دوسرے نشان کا پیچھا شروع کیا۔ ہم اڑھائی بجے اس ہاتھی تک پہنچے جو املی کے ایک بڑے درخت کے سائے میں آرام سے کھڑا تھا۔ یہ بھی مطلوبہ ہاتھی نہیں تھا۔ یہ وہی ہاتھی تھا جس کا ہم نے پہلے پہل پیچھا کیا تھا۔

اب یہ ظاہر ہو چکا تھا کہ پاگل ہاتھی اس علاقے میں نہیں ہے۔ تین دن گزر چکے تھے مگر میں ابھی تک ناکام رہا تھا۔

پانچ بجے ہم بنگلے پہنچے اور چائے کی دیگچی تیار کی۔ ساڑھے پانچ بجے انچپٹی سے تین بیل گاڑیاں آئیں جو یہاں سے آٹھ میل دور ہے۔ ان کا مقصد یہاں رات گزارنا تھا تاکہ ہاتھی کے خطرے سے بچ سکیں۔ انھوں نے بتایا کہ نصف راستے پر انہیں گولا موٹھی ندی مین ایک بڑے ہاتھی کے نشانات ملے جو بار بار اس راستے کو عبور کر رہا تھا۔

اس موقعے سے فائدہ کے لیے میں اور رنگا رات کا کھانا کھا کر جلدی جلدی تیار ہو گئے اور فارسٹ گارڈ کو بھی کار میں ساتھ بٹھا کر مطلوبہ مقام کو روانہ ہو گئے۔

سات بجے ہم اس مقام پر پہنچے تو تاریکی چھا چکی تھی۔ کار کی روشنی میں ہمیں ہاتھی کے قدموں کے نشانات ملے۔ ٹارچ کی روشنی میں ہم نے ہاتھی کے بڑے بڑے پیروں کے نشان بیل گاڑیوں کے نشانات کے اوپر ثبت دیکھے۔ ہاتھی گرم موسم میں دن کے وقت مٹر گشت نہیں کرتے۔ یہ ہاتھی ہماری آمد سے قبل یہاں پھر رہا تھا اور شاید ہماری کار کی آواز سن کر یا اس کی بتیاں دیکھ کر کہیں چھپ گیا ہو گا۔

ہم نے سٹڈ بیکر کی چھت اتاری اور میں نے رنگا کو سپاٹ لائٹ تھما دی تاکہ وہ پچھلی نشست پر بیٹھے۔ گارڈ کو میں نے اگلی نشست پر بٹھایا۔ میں اتری ہوئی چھت پر بیٹھا اور میرے پیر ڈرائیونگ سیٹ پر تھے۔ ٹارچ اور رائفل تیار تھے۔ ہر طرف گہری تاریکی تھی اور ہمارے آس پاس مٹھی اور جامن کے درخت ندی کے کنارے اگے ہوئے تھے اور بانس کے جھنڈ بھی۔ جب بھی ہوا چلتی تو بانسوں سے آوازیں آتیں۔

امکانات کم لگ رہے تھے۔ سب سے پہلے تو ہمیں یہ علم نہیں تھا کہ آیا یہ نشانات پاگل ہاتھی کے ہی ہیں۔ عین ممکن ہے کہ کوئی دوسرا ہاتھی ہو۔ البتہ یہ بات یقینی تھی کہ گرہٹی میں دیکھے جانے والے دیگر ہاتھیوں کی نسبت یہ نشانات مختلف تھے۔ دوسرا یہ بھی ہاتھی کے واپس لوٹنے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ تیسرا یہ کہ دو گھنٹے میں ہاتھی بہ آسانی دس میل کا سفر کر سکتا ہے۔ چوتھا یہ کہ ہوا ہر سمت سے چل رہی تھی اور اگر یہ ہاتھی پاگل نہ ہوتا تو ہماری بو سونگھ کر دور سے ہی فرار ہو جاتا۔ مگر دوسری جانب یہ بھی امکان تھا کہ اگر یہ ہاتھی پاگل ہے تو ہماری بو سونگھ کر کھینچا چلا آئے گا۔

ہم نے ساڑھے آٹھ بجے تک تاریکی میں انتظار کیا اور پھر اچانک ندی کے اوپر کی جانب کہیں ایک کھوکھلے تنے کے گرنے کی آواز آئی۔ ہاتھی حرکت کر رہا تھا اور آواز سے اندازہ ہوا کہ چار یا پانچ سو گز دور ہو گا۔ پھر اگلے پندرہ منٹ تک خاموشی رہی اور پھر بہت قریب سے ایک شاخ ٹوٹنے کی آواز آئی۔ ظاہر ہے کہ ہاتھی ہماری جانب آ رہا تھا اور پیٹ بھی بھر رہا تھا۔

مجھے علم تھا کہ ہاتھی نے ابھی جو شاخ توڑی ہے، سو اسے کھانے میں نصف گھنٹہ تو لگ ہی جائے گا۔ دریا کے موڑ مڑتے ہی ہاتھی کو ہماری کار اور ہم دکھائی دے جائیں گے۔ اگر ہاتھی پاگل نہیں تھا تو ہمیں دیکھتے ہی فرار ہو جاتا۔ مگر میں یہ سوچتے ہوئے بھول گیا کہ تیز ہوا ہم سے ہاتھی کی طرف جا رہی تھی۔

چند منٹ کی خاموشی کے بعد کار کے قریب دریا کے کنارے جھاڑیوں سے سرسراہٹ کی آواز آئی۔ یہ آواز اتنی معمولی تھی کہ جیسے کوئی چھوٹا جانور ان میں سے گزرا ہو۔ پھر اچانک بانس کے کچلے جانے کی آواز آئی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ ہوا بھی رک گئی۔

پھر حملہ کرتے ہاتھی کی فلک شگاف آواز آئی اور دوڑتے ہوئے ہاتھی کے سامنے بانس گرتے اور کچلے جانے لگے۔

رنگا نے سکون کے ساتھ روشنی ڈالی جو تاریکی کو چیرتی ہوئی ہاتھی پر پڑی اور میری ٹارچ کی روشنی بھی ہاتھی پر پڑی۔ بہت بڑا اور کالا سیاہ ہاتھی تھا جس نے اپنی سونڈ موڑ کر اٹھائی ہوئی تھی اور دو سفید دانتوں کے سرے مل رہے تھے۔

پچاس گز کے فاصلے سے میری دائیں نال سے نکلنے والی گولی ہاتھی کے گلے میں پیوست ہو گئی۔ گولی کے دھکے سے ہاتھی رکا اور تکلیف سے چیخ ماری۔ ہاتھی دھماکے، تکلیف اور روشنی سے بوکھلا گیا اور جنگل کی سمت مڑا۔ میں نے دوسری گولی بعجلت اس کی کنپٹی پر چلائی جو سر میں کہیں پیوست ہوئی۔ ہاتھی جنگل کی سمت بھاگتے ہوئے ٹھوکر کھا کر گرا اور جتنی دیر میں رائفل دوبارہ بھرتا، ہاتھی پھر اٹھا۔ میری تیسری گولی اس کے جسم میں کہیں پیوست ہوئی۔ پندرہ منٹ تک اس کے فرار کی آوازیں سنائی دیتی رہیں اور فرار کے دوران ہاتھی کئی بار گرا اور گر کر اٹھا۔

کار کو سٹارٹ کر کے ہم واپس گرہٹی لوٹے۔ رنگا نے علی الصبح مجھے بیدار کر کے گرما گرم چائے پیش کی۔

ساڑھے چھ بجے ہم پھر ہاتھی کے پیچھے روانہ ہو گئے تھے۔ جگہ جگہ اس کے گلے سے نکلنے والے خون کے لوتھڑے دکھائی دیتے رہے۔ اس کے فرار کے راستے پر جھاڑیاں بھی خون سے رنگین تھیں۔ ہاتھی کے پیچھے جھاڑیوں میں چلتے ہوئے ہمارے کپڑے بھی خون میں لت پت ہوتے گئے۔

ہاتھی کئی جگہ گرا تھا اور ہر بار سبز گھاس لال ہو چکی تھی۔ مجھے اس قاتل ہاتھی کی حالت پر ترس آیا۔

دو میل بعد وہ دکھائی دیا۔ گھٹنوں کے بل جھکا ہوا اور درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ وہ اتنا کمزور تھا کہ بمشکل حرکت کر پا رہا تھا۔ جب اس نے مجھے آتے دیکھا تو بھی حرکت نہیں کی۔ اس کی ننھی سرخ آنکھوں میں ابھی جان باقی تھی۔ وہ مجھے آتے دیکھتا رہا۔ پندرہ گز کے فاصلے پر رک کر میں نے اسے تکلیف سے نجات دلانے کے لیے رائفل اٹھائی۔ وہ سر سے پیر تک لرزا اور اپنے پیروں پر کھڑا ہوا۔ اس کی اونچائی دس فٹ سے زیادہ تھی۔ اس کی سونڈ آگے کو بڑھی اور کان ہلے اور اس نے میری جانب دو قدم اٹھائے۔ عین اسی وقت اعشاریہ ۴۵۰/۴۰۰ بور کی بھاری رائفل سے نکلنے والی گولی ہاتھی کے ماتھے میں گھسی اور ہاتھی وہیں گر گیا۔

قاتل ہونے کے باوجود ہاتھی حوصلہ مند تھا۔ نال سے دھواں نکل رہا تھا۔

۵ سنگم کا تیندوا

بنگلور میں مجھے گھر پر اطلاع ملی کہ سنگم کے نواح میں ایک تیندوا آدم خور ہو گیا ہے۔ یہ مقام بنگلور سے ستر میل جنوب میں ہے۔

جنوبی ہندوستان میں آدم خور تیندوے بہت کم ملتے ہیں۔ سب سے پہلی وجہ تو یہ ہے کہ یہاں جنگل نہ تو بہت زیادہ ہوتے ہیں اور نہ ہی مسلسل پہاڑ ہیں جیسا کہ شمال میں ہمالیہ ہے۔ مغربی گھاٹ ایک استثناء ہے کہ یہ پہاڑی سلسلے چار سو میل سے زیادہ طویل اور دس سے پندرہ میل چوڑائی میں پھیلے ہوئے اور گھنے جنگل رکھتے ہیں۔ تاہم دیگر جنگلات اتنے گھنے نہیں۔ اسی وجہ سے درندے اور بالخصوص تیندوے مویشیوں اور بکریوں پر ہاتھ صاف کرنے لگ جاتے ہیں۔ یہاں بکریاں اور مویشی بکثرت ہیں اور بسا اوقات پالتو کتے بھی ان کا کھاجا بنتے ہیں۔ کتے اور بندر اس علاقے میں انتہائی نقصان دہ ہیں۔ یہ کتے گرمیوں میں ریبیز کا شکار ہو جاتے تھے اور ان کے کاٹنے سے بے شمار انسان ہر سال اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے اور جب باؤلے کتے کے علاج کی ویکسین آئی تو صورتحال بہتر ہوئی۔ بندر ہمیشہ نقصان دہ ہوتے ہیں اور فصلوں اور پھل دار درختوں کی تباہی کا سبب بنتے ہیں۔ ہندو مت کے ماننے والے بندر کو مقدس جانور گردانتے ہیں اور ان کی ہلاکت یا روک تھام کے سلسلے میں کسی بھی اقدام کی سختی سے مخالفت کرتے ہیں۔ سو جہاں تک کتوں اور بندروں کا تعلق ہے تو تیندوے فائدہ مند ہیں۔

ابھی میں نے مغربی گھاٹ کا ذکر کیا ہے جہاں بارش بہت زیادہ ہوتی ہے اور اکثر سالانہ ۱۰۰ انچ سے زیادہ ہوتی ہے۔ یہاں بانس کے گھنے جنگلات ہیں اور لمبی گھاس اور سدا بہار جھاڑیاں پائی جاتی ہیں اور یہاں مچھر، مکھیاں اور دیگر طفیلیے بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ تیندوؤں کو نہ تو پانی پسند

ہے اور نہ ہی حشرات۔ اس لیے وہ ایسی جگہوں پر پائے جاتے ہیں جہاں یہ چیزیں موجود نہ ہوں۔ قدرتی طور پر جنوبی ہندوستان میں جہاں جہاں تیندوے ملتے ہیں، وہاں ان کے لیے کافی خوراک موجود ہوتی ہے سو وہ آدم خوری کی طرف مائل نہیں ہوتے۔ تاہم گملا پور کا تیندوا ایک استثنا تھا جس کے بارے میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ وہ کن حالات میں آدم خوری کی طرف مائل ہوا۔

بنگلور میں شیروں اور تیندوؤں کے ہاتھوں لوگوں کے زخمی ہونے کے بارے اکثر خبریں پہنچتی تھیں جن میں سے تیندوؤں کا ذکر زیادہ ہوتا تھا۔ تاہم ان کو کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا کہ تحقیق کا ایک ہی نتیجہ نکلتا تھا کہ کسی کسان نے اپنی توڑے دار بندوق سے یا کسی اناڑی شکاری نے اندازے سے تیندوے پر گراپ چلائے ہوتے تھے جن سے وہ محض زخمی ہوتا تھا۔ اس کے بعد نا تجربہ کار شکاری جب وہ گھنے جنگل میں جانور کا پیچھا کرتا تو تیندوا زخموں کی تکلیف کے سبب اسے گھائل کر دیتا۔ گزشتہ برسوں میں ایسے واقعات کا کم از کم پچھتّر فیصد حصہ زخم خراب ہونے کے سبب ہونے والی اموات کا ہوتا تھا۔ تاہم سلفا ادویات کی آمد کے بعد یہ تناسب دس فیصد سے بھی کم رہ گیا۔

سو ایسی خبروں پر کوئی توجہ نہیں دیتا تھا۔ وجہ بھی تو کوئی ہو۔ مجھے اور کام بہت ہوتے تھے۔ مزید یہ بھی کہ ہندوستان میں افواہیں بہت زیادہ پھیلتی ہیں۔ ہلکی خراش کو شدید زخمی بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ جب ایک اصل ہلاکت ہو تو اخبار اسے بے شمار ہلاکتیں بنا کر پیش کرتے ہیں۔ سو جب مجھے خبر ملی کہ تیندوے نے ایک عورت کو ہلاک کر دیا ہے اور پھر بعد میں ایک بچے کو بھی سنگم میں کھا گیا ہے تو میں نے یقین نہیں کیا۔ پھر تیندوے نے تیسرا اور چوتھا شکار کیا۔ اخباروں کے صفحہ اوّل پر یہ خبریں چھپیں۔

بنگلور، میسور اور مدراس سے بہت سارے شکاری اس تیندوے کے پیچھے گئے اور ایک شکاری نے ایک تیندوا بھی شکار کر لیا۔ ایک مہینہ گزر گیا اور تیندوے نے مزید کوئی واردات نہیں کی۔ سب یہی سمجھے کہ آدم خور تیندوا ہلاک ہو گیا ہے۔ سو سبھی شکاری واپس لوٹ آئے۔

پھر تیندوے نے ایک اور واردات کی مگر اپنے شکار کو لے جانے میں کامیاب نہ ہو سکا کہ متوفی اپنے چھپّر میں چار پہاڑی کتوں کے ساتھ سو رہا تھا۔ یہ کتے ہرنوں اور خرگوشوں کے شکار کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ چھپّر کے دروازے کی جگہ خاردار جھاڑیاں تھیں اور چھت جست کی چادروں پر مشتمل تھی جبکہ قریب قریب لکڑیاں گاڑ کر اور ان میں کانٹے دار جھاڑیاں پھنسا کر دیواریں بنائی تھیں۔ تیندوا رات کو آیا اور اس نے اپنے پنجوں سے دروازے اور لکڑیوں کے درمیان سوراخ کر لیا۔ تیندوے کی بو پا کر کتے خبردار ہو گئے اور زور زور سے بھونکتے ہوئے ایک طرف سمٹ گئے۔ ظاہر ہے کہ اس شور سے بندہ بیدار ہو گیا ہو گا۔

تیندوا اندر داخل ہوا۔ کتے ایک طرف جمع ہو گئے مگر انہوں نے اور کچھ نہ کیا۔ تیندوا ان کے قریب سے گزر کر بندے کے پاس پہنچا اور اس کے گلے کو دبوچ لیا۔ ایک چیخ مار کر وہ بندہ ہلاک ہو گیا۔

پاس والے جھونپڑے کے مکین کتوں کے بھونکنے اور تیندوے کے غرانے سے بیدار ہو گئے اور سوچنے لگے کہ کیا ہو رہا ہے مگر کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ باہر نکل کر دیکھتے۔ تیندوے نے اسی سوراخ سے اس بندے کی لاش کو باہر نکالنے کی کوشش کی مگر سوراخ کافی چھوٹا تھا۔ سو تیندوا باہر نکل کر لاش کو باہر گھسیٹنے کی کوشش کرنے لگا۔ لاش کانٹوں میں پھنس گئی۔ تیندوے نے زور کا

جھٹکا دیا تو جنگلا زور سے تیندوے پر گرا۔ خوفزدہ ہو کر تیندوے نے راہِ فرار اختیار کی جبکہ متوفی کی لاش اسی طرح پھنسی رہی۔

تیندوے کے شور سے ہمسائیوں کو علم ہو گیا کہ کیا ہو رہا ہے۔ انہوں نے شور مچا کر پورے گاؤں کو بیدار کر دیا۔ کافی دیر بعد کچھ بہادر دیہاتی لالٹین اور توڑے دار بندوقیں، لاٹھیں اور ڈنڈے لے کر نکلے تو متوفی کی لاش ملی مگر تیندوا غائب تھا۔

لوگ خبردار ہو گئے اور پٹیل نے خود بنگلور آ کر مجھے خبر پہنچائی۔ اس وقت مجھے دو دن کی چھٹی مل سکی اور اتوار ملا کر تین دن بنے۔ سو میں نے پٹیل سے ان تین دن تیندوے کے شکار کی کوشش کا وعدہ کیا۔

سنگم کو جانے والا راستہ کنکان ہالی سے گزرتا ہے جو بنگلور سے ۳۶ میل دور ہے یہاں سڑک دریائے کاویری میں اچانک خم کھا کر اترتی ہے۔ آخری دس میل راستہ انتہائی خستہ ہے اور کار کے انجر پنجر ڈھیلے ہو گئے۔ انتہائی دشوار چڑھائیاں، چوڑے موڑ اور مشکل زاویے (اس علاقے میں جنگلی ہاتھیوں سے بچاؤ کی خاطر سنگِ میل اور دیگر علامتیں کالے رنگ سے بنائی جاتی ہیں) سے گزر کر آخر کار میں چھوٹے مسافر بنگلے کو پہنچا۔ سفر مختصر مگر انتہائی مشکل تھا۔

سنگم کا نام یہاں دریائے کاویری اور ارکراوتھی کے ملاپ کی جگہ کو کہا جاتا تھا جو یہاں سے جنوب کی سمت سیدھا بنگلور کی سمت بہتا ہے۔

یہاں سے دریائے کاویری غرباً شرقاً بہتا ہے اور سنگم اس کے شمالی کنارے پر ریاست میسور میں واقع ہے۔ جنوبی کنارے پر شمالی کومبتور کا ضلع ہے۔ سنگم سے مشرق میں تیرہ میل دور میسور ریاست ختم ہوتی اور ضلع سالم شروع ہوتا ہے۔ جنوبی کنارے پر ضلع شمالی کومبتور ہے۔ شمالی کومبتور اور سالم ضلع، دونوں ہی مدراس پریزیڈنسی میں واقع ہیں۔

سنگم درختوں سے بھرا اور خوبصورت علاقہ ہے اور یہاں مہاشیر مچھلی کا بہترین شکار بھی ہوتا ہے جبکہ اس کے ریتلے کناروں پر مگرمچھ کا شکار بھی کیا جا سکتا ہے۔ میسور والی جانب کے جنگل میں چیتل، سانبھر، کاکڑ، جنگلی سور اور پرندوں کے علاوہ کبھی کبھار ریچھ، تیندوے اور شیر بھی مل جاتے ہیں۔ ہاتھی کومبتور والے کنارے کو اکثر عبور کرتے رہتے ہیں۔ جنوبی کنارے کے ساتھ ساتھ کومبتور کے جنگلوں میں جنگلی بھینسوں کے کئی ریوڑ بھی پائے جاتے ہیں۔ ہاتھی اور ریچھ تو یہاں عام ملتے ہیں۔

کار کو دریا کے کنارے مٹھی کے بڑے درختوں کے نیچے روک کر میں نے پاس ہی اس دیہات کا چکر لگایا جہاں کتوں کا رکھوالا مارا گیا تھا اور خود جائے وقوعہ کا معائنہ کیا۔ ہمسائیوں نے سارے وقوعے کی تفصیلات بھی بیان کیں جنہوں نے یہ سب کچھ ہوتے سنا مگر مدد کرنے کی کوشش نہیں کی۔ پٹیل جو میرے ساتھ ہی آیا تھا، نے بھی اپنی طرف سے اس واقعے کی تفصیل بتائی۔

سوال و جواب سے ظاہر ہو گیا کہ تیندوے کا شکار کافی مشکل ہو گا کیونکہ شمالی کنارے کا جنگل بہت بڑا اور وسیع ہے جبکہ کومبتور والی جنوبی سمت بھی جنگل میلوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ تاہم جنوبی کنارے کی اتنی اہمیت نہیں تھی کہ شیر اور تیندوے پانی کے شائق نہیں ہوتے اور بڑے دریا عبور کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔ تاہم اگر انہیں عبور کرنا پڑے تو بہت اچھے تیراک ثابت ہوتے ہیں۔

سب سے پہلا اور متوقع کام گارے باندھنا تھا۔ پٹیل کی مدد سے میں نے پانچ بچھڑے خریدے۔ پہلے کو ہم نے بنگلے سے مغرب کی جانب نصف میل کی دوری پر باندھا جہاں سے دریا بھی اتنا ہی دور تھا۔ دوسرا دریا کے ساتھ سیدھی لکیر میں ایک میل مزید مغرب کی سمت باندھا، تیسرا اس سے ایک میل مزید دور، چوتھا ارکاورتھی ندی کے کنارے بنگلے اور دریائے کاویری دونوں سے نصف میل دور جبکہ پانچواں اس سے ایک میل مشرق میں باندھا۔ اس طرح یہ پانچوں تقریباً ایک سیدھے خط میں باندھے گئے تھے اور دریا سے ان کا زیادہ سے زیادہ فاصلہ نصف میل تھا۔ مشرق سے مغرب تک ان کا کل فاصلہ چار میل تھا۔

مغرب کے بعد میں بنگلے پہنچا۔ برآمدے میں بیٹھ کر ٹھنڈے کھانے سے پیٹ بھرا اور پھر چائے کے دو مگ پیے۔ پھر پائپ سلگا کر میں نے دیوار سے ٹیک لگائی اور دریا کے بہاؤ کی آواز سننے لگا۔ رات کافی تاریک اور مطلع ابر آلود تھا۔ تھوڑے بہت ستارے گزرتے بادلوں سے دکھائی دے جاتے مگر ان کی روشنی ناکافی تھی۔ سو میں کمرے میں سونے چلا گیا۔

اگلی صبح ہم نے گاروں کو دیکھا۔ سبھی زندہ سلامت تھے۔ میں نے پچھلے روز والی سڑک پر مٹر گشت کی۔ تاہم کہیں تیندوے کے پگ دکھائی نہ دیے۔ چیتلوں کے ایک مندے اور تین سانبھر کے پگ دکھائی دیے جو رات کو یہاں سے گزرے تھے مگر کسی اور جانور کے پگ نہ دکھائی دیے۔

بنگلے کو واپس لوٹتے ہوئے میں نے سڑک کی بجائے پہاڑی اور جنگل سے گزرنے کا فیصلہ کیا اور راستے میں ارکاورتھی ندی کے خشک پاٹ سے گزرا اور وہاں سے جنوب کا رخ کیا اور نہر کے ریتلے پیندے پر چلتے ہوئے پگ تلاش کرتا گیا۔ تاہم کوئی پگ نہ دکھائی دیے۔ چیتلوں کا وہی مندہ یہاں

سے بھی گزرا تھا۔ جلد ہی میں چوتھے گارے کے قریب سے گزرا اور اس مقام پر پہنچا جہاں ارکاور تھی ندی دریائے کاویری میں گرتی ہے۔

تین میں سے ڈیڑھ دن گزر چکے تھے اور میں نے ابھی تک تیندوے کے پگ بھی نہیں دیکھے تھے۔ صورتحال کافی مایوس کن تھی۔

دوپہر کا کھانا کھا کر میں نے مشرقی سمت جانے کا سوچا۔ یہاں ساڑھے تین میل دور دریا ایک کھائی سے گزرتے ہوئے محض بیس فٹ چوڑا رہ جاتا ہے۔ اس مقام کو مقامی زبان میں 'بکری کی جست' کہا جاتا ہے۔ روایت ہے کہ بہت برس پہلے جنگلی کتوں سے بچاؤ کے لیے یہاں جنگلی بھیڑ بھاگتی ہوئی کوبمتور کی جانب سے آئی اور دریا کے کنارے اس نے عظیم جست لگائی اور میسور والی سمت پہنچ کر کتوں سے بچ گئی۔

یہاں پانی کے شور کے سامنے ہر قسم کی آواز دب جاتی ہے اور انسان کو اپنی چیخ بھی سنائی نہیں دیتی۔ میں چٹانوں پر بیٹھ کر پانی کو دیکھتا رہا۔ سو گز دور پانی کی سطح پھر ہموار ہو گئی تھی اور کبھی کبھار کوئی مچھلی ہوا میں جست لگا کر پانی کی سطح سے نکلتی۔ مچھلی خور باز آسمان پر چکر کاٹ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے واپس بنگلے کا رخ کیا۔ ابھی تک تیندوے کے پگ دکھائی نہیں دیے تھے۔

رات کو مطلع صاف تھا۔ اگرچہ چاند نہیں تھا مگر ستاروں کی روشنی اتنی تھی کہ چند گز دور کی چیز صاف دکھائی دیتی تھی۔

بنگلے کے رکھوالے کے پاس ایک دیسی کتا تھا جو میں نے اپنی عادت کے برخلاف گارے کی نیت سے نصف شب کے لیے ادھار مانگ لیا۔ پہلے تو وہ جھجھکا مگر پھر تین روپے لے کر اس نے کتا میرے حوالے کر دیا۔

دن کے وقت چلتے ہوئے میں نے ایک میل دور ایک پتھریلا کنارہ دیکھا تھا۔ میں نے کتے کو وہاں لے جا کر ایک پتھر سے باندھ دیا اور خود ایک طرف ہٹ گیا۔ پھر جب کتا نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میں واپس اس چٹان کی سمت چھپتا چھپاتا پہنچا۔ پھر انتہائی خاموشی سے میں اس چٹان پر چڑھا اور لیٹ گیا۔ پتھر ابھی تک سورج کی گرمی سے تپ رہا تھا۔

کتا سمجھا کہ میں اسے چھوڑ کر چلا گیا ہوں، سو اس نے بھونکنا اور رونا شروع کر دیا۔ کتا بہت عقلمند جانور ہے اور اسے گارا بنانا ظلم ہے۔ گائے بکری کے برعکس کتوں کو خطرے کا احساس فوراً ہو جاتا ہے اور اگرچہ ان پر حملہ نہ بھی ہو تو بھی وہ بہت دیر تک ذہنی تکلیف کا شکار رہتے ہیں۔ ایک بار ایک کتے کو جب گارے کے طور پر باندھا گیا تو تیندوے نے اس پر حملہ نہیں کیا۔ مگر اگلے روز کتا بیمار پڑ گیا اور ایک ہفتے بعد مر گیا۔

میں چٹان کے اوپر سے دیکھتا رہا۔ ایک گھنٹہ گزر گیا اور پھر ایک بھورے رنگ کا سایہ سا سڑک پر آتا دکھائی دیا۔ یہ سایہ کتے سے دس فٹ دور رک گیا۔ کیا یہ تیندوا ہے؟

ستاروں کی روشنی اتنی مدھم ہوتی ہے کہ محض تاریکی کم گہری ہو جاتی ہے مگر کچھ واضح دکھائی نہیں دیتا۔ مجھے محض ایک بھورے رنگ کا سایہ سا کتے کی طرف متوجہ دکھائی دیا۔ کتے کا رخ اسی کی جانب تھا اور زور زور سے غرا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ تیندوا ہی ہوگا، اور پھر میں نے اس سمت رائفل اٹھائی اور رائفل پر لگی ٹارچ جلائی۔

یہ سایہ لگڑ بگڑ کا تھا جو جنوبی ہندوستان میں عام پایا جاتا ہے۔ کتا اور زور سے غرا رہا تھا اور پھر بھونکنے لگا۔

اب اصل ڈرامہ شروع ہوا جو ہندوستانی جنگلوں میں چند ہی لوگوں نے دیکھا ہوگا۔ لگڑ بگڑ دوڑ کر کنارے پر موجود جھاڑیوں میں چھپ گیا اور اپنی منحوس آواز میں بولنے لگا۔

کتا اس کی جانب منہ کر اور زور سے بھونکنے لگا۔ پھر لگڑ بگڑ کا شور بڑھ گیا۔

افریقی لگڑ بگڑ کی آواز ہنسی سے مشابہہ ہوتی ہے جبکہ ہندوستانی بھورا اور دھاری دار لگڑ بگڑ عموماً خاموش رہتا ہے اور اکیلا یا جوڑے کی صورت میں شکار پر نکلتا ہے۔ دھبے دار لگڑ بگڑ غول کی صورت میں پھرتا ہے۔ اصولی طور پر تمام لگڑ بگڑ بزدل ہوتے ہیں مگر ان کی جسامت کے حساب طاقتور سے ان کے جبڑے بہت مضبوط ہوتے ہیں۔ اگر یہ انسان کے بازو پر کاٹے تو بازو صاف الگ ہو جائے گا۔

لگڑ بگڑ کبھی کبھار انتہائی بہادری کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں جن میں سے ایک کا میں نے مشاہدہ کیا تھا۔ میں ایک بار تیندوے کے شکار کے لیے مچان پر بیٹھا تھا۔ تیندوا آ گیا اور پیٹ بھرنے لگا۔ میں نے تیندوے کی جنس کے بارے جاننے کی غرض سے انتظار کیا۔ مجھے اطلاع ملی تھی کہ اس جگہ ایک نر اور ایک مادہ تیندوا موجود ہیں اور مادہ کے ساتھ چھ ماہ کے دو بچے بھی ہیں۔ سو میں نر کو مارنے کے ارادے سے آیا تھا۔

جتنی دیر میں انتظار کرتا رہا، لگڑ بگڑ بھی پہنچ گیا اور اس مرتبہ اس کی آمد کافی ڈرامائی تھی۔ مجھے اس کی آمد کی اطلاع تک نہ ہوئی اور وہ اچانک عجیب عجیب آوازیں نکالتا ہوا تیندوے پر چڑھ دوڑا۔

تیندوا اپنے شکار پر چڑھ کر اسے گھورنے لگا اور غرانے لگا۔ لگڑ بگڑ تیندوے سے پانچ فٹ کے فاصلے پر پہنچ کر انتہائی منحوس آوازیں نکالنے لگا جیسے کوئی بد روح واویلا کر رہی ہو۔

تیندوا بھی زیادہ زور سے غرانے لگا اور بار بار لگڑ بگڑ کو پنجہ مارنے کی کوشش کرتا۔ تاہم ہر بار لگڑ بگڑ پیچھے ہٹ جاتا اور پھر فوراً آگے بڑھتا اور تیندوے کے عقب کا رخ کرتا۔ پہلے پہل تو تیندوا بھی اس کے ساتھ ساتھ گھومتا رہا اور پنجہ گھماتے ہوئے لگڑ بگڑ کو بھگانے کی کوشش کرتا رہا۔ تاہم لگڑ بگڑ ہمیشہ اس کی پہنچ سے دور رہا اور اسی طرح آوازیں نکالتا رہا۔

ڈر یا پھر تنفر کے مارے تیندوا آخر کار اپنے شکار سے ہٹ کر ایک طرف چل دیا جبکہ لگڑ بگڑ کی منحوس آوازیں جاری رہیں حتیٰ کہ تیندوا جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ پھر اس نے شکار کا رخ کیا اور انتہائی رغبت سے گوشت کھانے لگا۔

تاہم جس لگڑ بگڑ کو میں اب دیکھ رہا تھا، وہ کتے سے خوفزدہ تھا۔ بار بار وہ سڑک کے ایک یا دوسری جانب غائب ہو جاتا اور پھر لوٹ آتا اور اس کی منحوس لے بھی جاری رہی۔

ان دونوں واقعات سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ لگڑ بگڑ اپنی منحوس آوازوں سے اپنے مخالف کو ڈرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پہلے لگڑ بگڑ نے تیندوے کو اس کے شکار سے بھگا دیا تھا اور اب یہ لگڑ بگڑ کتے کو اس لیے ڈرا رہا ہو گا کہ کتا راستے سے ہٹ جائے یا پھر جھاڑیوں میں گھسے تاکہ اس پر حملہ آسان ہو۔

چونکہ کتا بندھا ہوا تھا، سو وہ اپنی جگہ سے ہٹ نہ سکا اور لگڑ بگڑ کو یہ بات سمجھ نہیں آئی۔ ایک گھنٹہ تک یہی کچھ ہوتا رہا اور آخر کار مجھے یقین ہو گیا کہ لگڑ بگڑ کی نحوست بھری آوازوں سے تیندوا کبھی کا دور نکل گیا ہو گا۔ سو میں نے ایک پتھر اٹھایا اور لگڑ بگڑ کو دے مارا۔ پتھر اس کے قریب گرا اور

سڑک پر آواز پیدا ہوئی۔ لگڑ بگڑ بوکھلاہٹ سے اچھلا اور جھاڑیوں میں گھس گیا۔ کتے نے بھونکنا بند کر کے کانپنا شروع کر دیا۔ میں سمجھا کہ لگڑ بگڑ اب دفع ہو گیا ہو گا۔

بمشکل پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ لگڑ بگڑ کی بکواس پھر شروع ہو گئی۔ کتا بھی بھونکنے اور غرانے لگا۔ میں نے ایک اور پتھر پھینکا اور اس بار دس منٹ کے لیے خاموشی چھا گئی۔ کئی بار یہی ہوا۔ پانچویں پتھر کے بعد جا کر لگڑ بگڑ کو احساس ہوا کہ اب اسے جانا چاہیے، سو دس بجے وہ دفع ہوا۔

بارہ بجے سے پانچ منٹ قبل مجھے انسانی آوازیں آتی سنائی دیں۔ تھوڑی دیر بعد دو لالٹینوں کی روشنیاں نمودار ہوئیں اور کئی افراد دکھائی دیے۔ کتے نے انہیں دیکھا تو چپ ہو گیا۔

جب وہ لوگ کتے کے قریب پہنچے تو میں نے گنا کہ وہ گیارہ تھے۔ دو کے پاس لالٹین تھے اور باقی تقریباً سبھی کے پاس لاٹھیاں اور ڈنڈے تھے۔ ایک بندہ توڑے دار بندوق سے مسلح تھا۔ وہ میری ہی تلاش میں آئے تھے۔ میں نے انہیں آواز دی اور چٹان سے اتر آیا۔

انھوں نے بتایا کہ ایک گھنٹہ قبل تیندوا اسی گاؤں کے ایک جھونپڑے میں گھسا اور پچیس سال کی ایک عورت کو گلے سے پکڑ لیا۔ اس جھونپڑے میں پانچ افراد سو رہے تھے۔ عورت نے چیخ ماری تو باقی سب بھی اٹھ گئے جو اس کا باپ، ماں اور دو بھائی تھے۔

اسی دوران تیندوا اس عورت کو گھسیٹ کر اسی سوراخ سے نکالنے کے چکر میں تھا کہ جس سے وہ اندر آیا تھا۔ لڑکی نے سخت مزاحمت کی۔ تیندوے نے اسے چھوڑ کر بھنبھوڑنا شروع کر دیا۔ ایک بھائی نے دیاسلائی جلا کر روشنی کی۔ اس کے باپ نے انتہائی بہادری اور حاضر دماغی کے ساتھ جو ہاتھ میں آیا، تیندوے پر دے مارا۔ اتفاق سے اس کے ہاتھ تانبے کا گھڑا لگا جو کافی وزنی تھا۔ آدم

خور چاہے تیندوا ہو یا شیر، ہمیشہ بزدل ہوتے ہیں اور یہ تیندوا بھی بزدل تھا۔ اپنے شکار کو چھوڑ کر اس نے فوراً راہِ فرار اختیار کی۔

زخمی لڑکی کی چیخوں اور گھر والوں کے شور کی وجہ سے پورا گاؤں بیدار ہو گیا تھا۔ مرد حضرات لالٹینوں اور لاٹھی ڈنڈوں سے مسلح ہو کر نکل آئے۔ پھر ان میں سے گیارہ افراد مجھے تلاش کرنے نکل کھڑے ہوئے اور بنگلے کے چوکیدار نے انہیں بتایا کہ میں اس کے کتے کے ساتھ کہاں بیٹھا ہوں گا۔

میں نے انہیں ہدایت کی کہ کتے کو کھول کر ساتھ لیتے آئیں اور ہم بعجلت بنگلے کو چل پڑے۔ وہاں کار کی عقبی نشست سے ابتدائی طبّی امداد کا سامان اٹھا کر ہم نے گاؤں کا رخ کیا جہاں خوفناک منظر دکھائی دیا۔ لڑکی کے دائیں شانے کو بری طرح چبایا گیا تھا۔ اس کے پیٹ پر بھی کافی زخم تھے۔ دائیں چھاتی اور پستان لیر لیر تھے۔ اس کی قمیض اور ساڑھی بھی پھٹ چکی تھی اور بیچاری لڑکی اپنے خون میں نہائی بیہوش پڑی تھی۔

مجھے فوراً پتہ چل گیا کہ ابتدائی طبّی امداد بالکل کافی نہیں ہو گی۔ سو اس کے زخموں کو پوٹاشیم پرمیگنیٹ کے محلول سے دھو کر میں نے ایک اور ساڑھی سے پٹیاں پھاڑ کر اس کے زخموں پر ہر ممکن احتیاط سے باندھ دیں۔ پھر اس کے باپ، دو بھائیوں اور تین دیگر افراد کی مدد سے اسے چارپائی پر ڈال کر بنگلے میں لائے اور وہاں اسے گاڑی میں احتیاط سے لٹا کر میں نے اس کے باپ اور بھائیوں کو ساتھ لیا اور سیدھا کنکان ہالی کا رخ کیا جہاں قریب ترین دیہاتی ہسپتال تھا۔ ساڑھے تین بجے ہم پہنچے اور ڈاکٹر کو جگا کر مریضہ اس کے حوالے کی۔ اس کی حالت کافی نازک تھی کہ خون بہت بہہ گیا تھا۔

ساڑھے چار بجے کنکان ہالی کے ٹریولر بنگلے کو پہنچ کر میں نے اپنے خون آلود کپڑے اتارے اور نہایا۔ پھر میں نے بنگلے کے بیرے سے کمبل اور صاف دھوتی ادھار لی کہ عجلت میں مجھے اپنے کپڑے ساتھ لانا یاد نہیں رہا تھا۔

پو پھٹ رہی تھی کہ میں نے ڈاک خانے پر دستک دی اور بہت مہربان پوسٹ ماسٹر کو نیند سے جگا کر لیٹ فیس کے ساتھ ہنگامی تار بنگلور بھیجا کہ مجھے چار دن کی اضافی رخصت دی جائے۔

جب میں بنگلے میں پہنچا تو لڑکی کا چھوٹا بھائی میرا منتظر تھا۔ اس نے روتے ہوئے بتایا کہ وہ ابھی ہسپتال سے یہ بتانے آیا ہے کہ اس کی بہن مر گئی ہے۔ کچھ دیر بعد اس کا باپ یہ درخواست کرنے آیا کہ متوفیہ کو اپنی کار میں سنگم پہنچا دوں تا کہ وہاں دریائے کاویرے کے کنارے اسے جلا کر راکھ بکھیر دی جائے۔ ظاہر ہے کہ ایسی درخواست کو کون رد کر سکتا ہے۔ اسی اثنا میں بیرے نے اپنی دھوتی اور کمبل واپس مانگ لیا۔ سو میں نے مجبوری میں اپنے خون آلود کپڑے دوبارہ پہنے۔

ہم ہسپتال گئے اور متوفیہ کی لاش کو پچھلی نشست پر رکھا اور واپس لوٹے۔ راستے میں پولیس میں رپورٹ درج کرانے میں دو گھنٹے مزید لگ گئے۔

دریا کے کنارے پر مگر مچھوں سے پاک سرد تالاب میں غسل کر کے میں نے کپڑے بدلے اور ٹھنڈا کھانا کھا کر گرما گرم چائے کے دو بڑے پیالے پیے۔ پھر بنگلے کے برآمدے میں پرانی کرسی پر نیم دراز ہو کر میں نے پائپ سلگایا اور ساری صورتحال کا جائزہ لیا اور اونگھنے لگا۔

تیندوے کے شکار کی خاطر میرے پاس کل چار دن اور پانچ راتیں تھیں۔ خدا جانے ابھی اور کتنے آدم خور اس علاقے کی قسمت میں لکھے تھے۔ جو حقائق سامنے آئے وہ کچھ یوں تھے: اول، تیندوا

گارے کو متوجہ نہیں ہوگا۔ دوئم، بہت بڑا علاقہ اس کی آماجگاہ ہے۔ سوئم، اب وہ لوگوں کو جھونپڑوں میں گھس کر بھی ہلاک کرنا شروع ہو گیا تھا۔ اسی دوران مجھے نیند آ گئی۔

تین بجے میں بیدار ہوا تو نیند کے دوران ہی مجھے لائحہ عمل سوجھ گیا تھا۔

سنگم کا چھوٹا سا دیہات بارہ گھروں پر مشتمل تھا اور عام رواج کے مطابق ایک گلی وسط سے گزرتی تھی اور دونوں جانب گھر بنے ہوئے تھے۔ مجھے یاد تھا کہ گلی کی جنوبی سمت اور دریا کے کنارے کے پاس مویشیوں کا ایک باڑہ تھا جہاں سارے گاؤں کے مویشی باندھے جاتے تھے۔ اس کے گرد بانسوں کی دیوار بنائی گئی تھی اور خاردار جھاڑیاں بانسوں میں اُڑس دی گئی تھیں۔ باقی گاؤں میں محض وہی کتے بچ گئے تھے جن کا مالک تیندوے کا شکار بنا تھا۔ یہ کتے اسی کے جھونپڑے میں بند تھے اور یہ جھونپڑا مویشیوں کے اسی باڑے کی مغربی دیوار کے ساتھ بنا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر باڑے کے اندر چھپ جاؤں تو تیندوے کی جانب سے اچانک حملے کا اندیشہ بھی نہیں رہے گا کہ مویشی تیندوے کی موجودگی بھانپ لیں گے۔ دوسرا پاس والے جھونپڑے سے کتے بھی شور کریں گے۔ اس کے علاوہ اپنے خریدے ہوئے پانچوں گارے بھی بندھوا تا رہوں گا شاید کہ تیندوا ان کی طرف متوجہ ہو جائے۔

یہ سوچ کر میں نے رات کے لیے گرم کپڑے پہنے۔ اس کے علاوہ چائے کا بڑا تھرماس، کچھ بسکٹ اور پائپ اور تمباکو بھی اٹھا لیے کہ احتیاط کی ضرورت نہیں تھی۔

تیندوے کی وجہ سے سارے گاؤں والے اپنے گھروں میں دبک گئے تھے اور دروازوں اور چھتوں پر خاردار جھاڑیاں کاٹ کر لگا دی گئی تھیں۔ سو میں نے باڑے کے وسط میں ڈیرہ جما لیا۔ یہاں سے ہر سمت پچاس پچاس گز تک باڑہ تھا اور سو کے قریب مویشی تھے۔

پہلے پہل مویشی میری موجودگی کو ناپسند کرتے رہے اور کناروں پر رہنے کو ترجیح دی۔ میں وسط میں اکیلا بیٹھا تھا۔ پھر میں نے ان سے دوستی کی کوشش شروع کر دی۔ ایک نے تو میری تھرماس کو لات مار دی۔ کچھ بیل کافی غصے میں تھے اور میں جب بھی ان سے قریب ہوتا تو سینگ دکھاتے۔ تاہم ایک گھنٹے کی محنت کے بعد ان سے کچھ کچھ دوستی شروع ہوئی اور کچھ مویشی میری جانب آنا شروع ہو گئے۔ نصف مویشی تو سونے کے لیے لیٹ گئے تھے۔ میں بھی لیٹ گیا۔

گھنٹے گزرتے رہے اور سناٹا رہا۔ کبھی کبھار کسی مویشی کے پھنکارنے کی آواز آ جاتی یا وہ حرکت کرتے۔ ایک گائے نے اپنی تھوتھنی میرے سینے سے لگا لی۔ آخرکار وہ میرے پاس ہی لیٹ گئی۔

مویشیوں کے پسو مجھے کاٹنے لگے۔ بار بار کھجلاتا اور یہ بھی علم تھا کہ جتنا کھجلاؤں گا، کھجلی اتنی بڑھتی جائے گی۔ سردی ہونے لگی تھی سو میں گائے کے ساتھ لیٹ گیا۔ وقتاً فوقتاً کوئی جانور آواز یا حرکت کرتا۔

گھنٹے گزرتے رہے اور پسو کاٹتے رہے۔ ایک بجے سانبھر گاؤں کے شمال والی پہاڑی پر سے آواز نکالی۔ مادہ سانبھر کی آواز تھی جو کئی بار آئی۔ پھر کاکڑ بولا۔

مادہ سانبھر خاموش ہو گئی تھی جبکہ کاکڑ نے پہاڑی پر چڑھ کر وقفے وقفے سے شور کرتا رہا۔ ان کے خوف کی جو بھی وجہ تھی، وہ اب پہاڑی سے اتر آئی تھی۔

بیس منٹ بعد چیتل بولنا شروع ہو گئے جو پہاڑی سے لے کر دریا کے کنارے تک پھیلے ہوئے تھے۔ انہیں شیر یا تیندوا دکھائی دیا ہوگا۔ اگلے چند منٹ میں پتہ چل جاتا کہ آیا یہ آدم خور ہے یا عام درندہ۔

تاریکی بہت گہری تھی کہ اچانک مویشی بیدار ہو گئے۔ ایک ساتھ سبھی زمین سے اٹھے اور میں بھی ان کے ساتھ اٹھا اور گائے کے پیچھے پیچھے رہا۔ کچھ بیل پھنکارنے لگے۔ ان سب کا رخ گاؤں کی گلی کی سمت تھا۔

سبھی مویشی بے چین ہو کر باڑے کے دوسرے سرے پر جمع ہو گئے۔ ساتھ والے جھونپڑے کے کتے جو اب تک بھونک رہے تھے، اب اچانک رونے لگے۔ ان کے خوف کی جو بھی وجہ تھی، وہ اس وقت عین ہمارے سامنے سے گزر رہی تھی۔

میں اس وقت تک مویشیوں کے وسط میں پھنس چکا تھا اور مجھے خیال رکھنا پڑ رہا تھا کہ کہیں مویشیوں کے سینگ نہ لگیں۔ پھر میں نے سامنے والے دروازے کی طرف راستہ بنانا شروع کیا تاکہ وہاں پہنچ کر کچھ دیکھ سکوں۔ مگر تاریکی اور باڑ کی وجہ سے کچھ نہ دکھائی دیا۔

مجھے کتوں کی آوازیں آ رہی تھیں جو اب بھونکنے کی بجائے رو رہے تھے۔ اگرچہ میرے کان معمولی سے معمولی آواز سننے کو تیار تھے مگر شور اتنا مچا ہوا تھا کہ کچھ سنائی نہ دیا۔ چند منٹ بعد مجھے ایسی آواز آئی جیسے کسی چیز کو کھرچا جا رہا ہو۔ مزید غور کیا تو یہ آواز گلی میں دائیں جانب سے آ رہی تھی۔ کتے مزید شور کرنے لگے۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ تیندوا کسی گھر کے دروازے کو توڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔

مویشیوں سے راستہ بنا کر میں باڑ کے پاس پہنچا اور ٹارچ جلانے کے بعد اچک کر دیکھنے لگا کہ شاید تیندوے کا کوئی حصہ دکھائی دے جائے۔ عین اسی لمحے اس جھونپڑے کے مکینوں نے شور مچا دیا اور کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔

میں سمجھا کہ آدم خور جھونپڑے میں گھس گیا ہے، میں نے احتیاط کا دامن چھوڑتے ہوئے باڑے کا دروازہ کھولا۔ بد قسمتی سے شام کو یہاں داخل ہوتے ہی میں نے Y شکل کا ایک ڈنڈا اس کے پیچھے گاڑ دیا تھا، جس کی وجہ سے دروازہ کھولنے میں چند سیکنڈ لگے۔ اسے ایک طرف پھینک کر میں نے ٹارچ جلائی اور دروازہ بند کر کے گلی میں آیا۔ تیندوا کہیں دکھائی نہ دیا۔ عقب سے حملے سے بچاؤ کی خاطر باڑے کی دیوار سے ٹیک لگا کر میں نے ہر طرف ٹارچ کی روشنی پھینکی مگر تیندوا غائب ہو چکا تھا۔ اس دوران جھونپڑے کے مکینوں کی چیخ و پکار پورے زور و شور سے جاری رہی۔

پھر مجھے خیال آیا کہ شاید تیندوا اسی جھونپڑے میں گھسا ہوا ہے اور مکینوں کو چیر پھاڑ رہا ہے۔ سو میں نے انتہائی احتیاط سے بیس گز کا فاصلہ طے کیا اور جھونپڑے کو جا پہنچا۔

جب میں اس کے دروازے کے سامنے پہنچا تو وہ بند تھا۔ میں نے مکینوں کو آواز دی۔ پہلے پہل تو ان کے شور کی وجہ سے میری آواز نہ سنائی دی مگر پھر جب میں نے دوبارہ زور سے آواز دی تو وہ لوگ بتدریج خاموش ہوتے گئے۔

میں نے انہیں دروازہ کھولنے کا کہا۔ مگر وہ اس پر تیار نہ تھے۔ پہلے انہوں نے پوچھا کہ میں انسان ہوں یا شیطان۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں کون ہوں اور یہ بھی کہ تیندوا جا چکا ہے۔ انہوں نے صاف انکار کیا اور کہا کہ اب یہ دروازہ صبح کو ہی کھلے گا۔ اس دوران میں نے ٹارچ کی روشنی میں زمین اور دروازے پر تیندوے کے پنجوں کے تازہ نشانات دیکھے جہاں وہ دروازہ توڑنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔

میں باڑے کو لوٹا اور دوبارہ ڈنڈا اسی طرح پھنسا کر دروازہ بند کیا اور اس جگہ کو لوٹا جہاں میں پہلے بیٹھا تھا۔

مجھے چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی۔ بدقسمتی سے مویشیوں نے بھاگ دوڑ میں میری تھرموس توڑ دی تھی۔ بسکٹ بھی کھائے جا چکے تھے اور جو گائے میرے پاس بیٹھی تھی، اب بسکٹ کے کاغذ کو چبا رہی تھی۔ خوش قسمتی سے میرا پائپ اور تمباکو جیب میں تھے، سو میں نے بقیہ رات پھر اسی گائے سے ٹیک لگا کر آرام سے کاٹی۔

صبح پو پھٹتے ہی میں بنگلے کو لوٹا تو بہت تھکا ماندہ اور مایوس تھا۔ پسوؤں کے کاٹنے سے شدید کھجلی ہو رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اگلے دس روز تک کھجلی بڑھتی جائے گی اور تکلیف میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

سرد پانی سے غسل کر کے میں نے گرم چائے، ڈبہ بند بیکن، ڈبل روٹی اور مکھن سے اپنا پیٹ بھرا اور ساڑھے سات بجے سو گیا۔ دوپہر کو کھانا کھانے اٹھا اور پھر دوبارہ تین بجے تک کے لیے سو گیا۔ پھر میں نے ایک اور منصوبہ سوچنا شروع کیا۔

ظاہر ہے کہ اب دوبارہ باڑے میں رکنا ناممکن تھا ورنہ پسو کاٹ کاٹ کر مجھے ادھ موا کر دیتے۔ تاہم یہ بات بھی اہم تھی کہ تیندوے کی آمد کے بارے مجھے مویشیوں اور کتوں نے ہی بروقت خبردار کیا تھا۔

آخرکار میں نے ایک نیا منصوبہ سوچا۔ کتوں والے جھونپڑے کی چھت جستی چادروں سے بنی تھی۔ اگر میں اس چھت پر لیٹ کر خود کو چھپا لیتا تو مجھے گلی صاف دکھائی دیتی اور جونہی تیندوا گزرتا، میں اسے مار لیتا۔ کتے اور مویشی مجھے تیندوے کی آمد سے خبردار کر دیتے۔ چھت پر اپنے پیچھے اور اطراف میں خاردار کانٹے بچھا کر وہاں سے بے خوف ہو جاتا۔ اگر تیندوا چھت پر جست بھی لگاتا تو اتنی آواز پیدا ہوتی کہ مجھے بخوبی سنائی دیتی۔ یہ واحد اور بہترین حل سجھائی دیا۔

سو اپنا شکاری سامان اٹھا کر میں گاؤں کو لوٹا۔ میں نے بسکٹ اور چائے بھی ساتھ لے لی تھی (چائے رکھنے کے لیے میں نے بنگلے کے چوکیدار سے شراب کی خالی بوتل ادھار لی تھی)۔ پھر دیہاتیوں کو اپنا منصوبہ بتایا تو وہ لوگ فوراً کانٹے اور خاردار جھاڑیاں کاٹ کر کتوں والے جھونپڑے کی چھت پر جمع کرنے لگے۔ کچھ لوگوں نے ان کانٹوں کے وسط میں بھوسہ بچھایا تاکہ مجھے زیادہ تکلیف نہ ہو۔

چھ بجے میں اپنی جگہ پر پہنچ گیا۔ فوراً ہی دو نقصانات معلوم پتہ چلے: پہلا تو یہ کہ گلی کا رخ کرنے پر میری ٹانگیں باقی جسم کی نسبت ذرا سا زیادہ بلندی پر تھیں کیونکہ چھت کا زاویہ کچھ ایسا تھا کہ بارش کا پانی گلی میں گرتا۔ دوسرا یہ کہ ساری رات مجھے اوندھا لیٹنا پڑتا کہ ذرا سی حرکت سے بھی خاصی آواز ہوتی تھی۔ تاہم میں اس طرح عقب سے حملے سے محفوظ تھا اور مجھے پوری گلی صاف دکھائی دے رہی تھی اور جونہی مویشی یا کتے بے چین ہوتے تو مجھے فوراً پتہ چل جاتا اور یہاں منحوس پسو بھی نہیں تھے۔

تاہم یہ رات سکون سے گزری اور تیندوا گاؤں سے دو یا تین میل قریب نہ آیا۔ اگلی صبح بنگلے میں پہنچا اور نہا دھو کر پھر سارا دن سو کر گزارا۔ ہر روز کئی آدمیوں کی جماعت پانچوں گاروں کی دیکھ بھال کرتی رہی مگر تیندوے نے انہیں چھوا تک نہیں۔

اس رات میں پھر چھت پر تھا۔ رات دو بجے کے قریب ہر طرف خاموشی تھی اور مجھے اونگھ آ گئی۔ اچانک جیسے کسی خواب سے بیدار ہوا ہوں، میں نے مویشیوں کو بے چینی سے حرکت کرتے سنا۔ پھر میرے نیچے سے ایک کتا بھونکا اور پھر چاروں مل کر رونے اور بھونکنے لگے۔

آہستگی سے آگے بڑھ کر میں نے گلی کو دونوں سمتوں میں دیکھا۔ ستاروں کی روشنی اتنی نہیں تھی کہ کچھ صاف دکھائی دیتا، مگر گلی محض اطراف سے ہلکی سی فرق دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے کچھ سنائی نہ دیا۔

اچانک مدھم سی آواز آئی۔ جیسے کوئی سانپ پھنکارا ہو۔ پھر دوبارہ وہی آواز سنائی دی۔ اس بار یہ آواز عین میرے نیچے سے آئی تھی۔ یہ سانپ کی آواز تھی یا پھر تیندوے کی، تیندوا جب اپنا اوپری ہونٹ سکوڑتا ہے تو ایسی آواز نکلتی ہے۔

میں نے نیچے گھورا مگر کچھ دکھائی نہ دیا۔ پھر اچانک عجیب لمبوترا سا دھبہ دکھائی دیا جو اطراف سے ذرا سا ہلکا تھا۔ یہ آواز اسی سے آئی تھی۔ کتے پورے زور سے بھونک اور رو رہے تھے۔ مویشی بھی بے چین تھے۔

اب مجھے احساس ہوا کہ میں عین نیچے گولی نہیں چلا سکتا۔ مجھے کم از کم ایک فٹ آگے بڑھنا تھا تاکہ میرے کندھے اور سر چھت سے باہر نکل آئیں۔ جونہی میں نے حرکت کی تو احتیاط کے باوجود بھوسے اور چھت سے ہلکی سی آواز آئی۔

پھر اسی دھبے سے غراہٹ کی آواز سنائی دی۔ تیندوے کو میرے موجودگی کا علم ہو چکا تھا۔ اب کسی بھی لمحے تیندوا جست کر کے مجھ پر حملہ کر سکتا تھا۔

پیروں سے اپنے جسم کو دھکیلتے ہوئے میں نے بقیہ فاصلہ طے کیا اور رائفل کا رخ نیچے کو کر کے ٹارچ جلائی۔ دو چمکتی ہوئی گولیاں دکھائی دیں۔ تیندوا جست لگانے کے لیے جھکا ہوا تھا۔ اتنے قریب سے ایک ہی گولی کافی تھی اور تیندوا وہیں گر گیا اور اس کی چمکدار آنکھیں سفید سے مدھم

نارنجی ہوئیں، پھر ہلکی سبز اور پھر بے جان ہو گئیں اور جامنی مائل نیلے رنگ کی روشنی منعکس ہوتی رہی۔

اگلی صبح جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ یہ بوڑھی مادہ تھی جس کے بڑے دانت مسوڑھوں تک گھس گئے تھے۔اس کی کھال بہت مدھم ہو چکی تھی اور دھبے بھی مدھم اور دھندلے ہو گئے تھے۔تاہم اس کے جسم پر کوئی زخم یا معذوری دکھائی نہیں دی۔شاید بڑھاپے کی وہ سے وہ جانوروں کا شکار کرنے سے معذور ہو گئی تھی اور انسانوں سے پیٹ بھرنے لگی۔ ہر آدم خور کی طرح اس کی جتنی بھی دہشت رہی، مگر وقت کے ساتھ دہشت اپنے انجام کو پہنچی۔ جدید آتشیں اسلحہ اور انسانی عقل جنگل کی مہارت اور بھوک سے کہیں طاقتور ہوتے ہیں۔

۶ راماپرم کا آدم خور

یہ کہانی ایک ایسے شیر کی ہے جس نے تین ماہ کے لیے آدھے ضلع کو مفلوج کر کے رکھ دیا تھا جو ساٹھ میل لمبا اور ساٹھ ہی میل چوڑا علاقہ بنتا تھا۔ اگرچہ اس کی حکمرانی نسبتاً مختصر تھی، مگر اس دوران وہ اپنی سلطنت کے ۳۶۰۰ مربع میل میں ہر جگہ موجود دکھائی دیتا رہا۔ ہر کوئی اس کے پیچھے تھا مگر وہ کسی کے ہاتھ نہ آیا۔ اس کا انجام انتہائی غیر متوقع تھا۔

شمالی کومبتور کا زیادہ تر حصہ پہاڑی اور جنگلوں پر مشتمل ہے۔ جنوب میں کومبتور کے میدان ہیں اور ڈِم بِم پر جا کر یہ اچانک اٹھتے ہیں۔ جنوب مغرب میں نیلگری یا نیلے پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ مغرب میں میسور کے جنگلات ہیں۔ شمال مغرب میں بلی گیریر نگم کی پہاڑیاں ہیں۔ شمال، شمال مشرق اور مشرق کی سمت دریائے کاویری بہتا ہے جس کے دونوں کناروں پر گھنے جنگل ہیں۔ شمال مشرقی اور مشرقی علاقے ضلع سالم سے ملتے ہیں۔

شمالی کومبتور کے ضلع میں واحد شہر کولیگل ہے جو شمال مغربی کنارے پر آباد ہے اور دریائے کاویری سے آٹھ میل دور۔ کولیگل سے چار سڑکیں نکلتی ہیں۔ مغرب اور شمال کو جانے والی سڑکیں جو میسور کو جاتی ہیں، ان کا اس کہانی سے کوئی تعلق نہیں۔ تیسری سڑک جنوب کو اور لگ بھگ سیدھی بلی گیریر نگم پہاڑیوں کے مشرقی سرے سے گزرتی ہے۔ اس سڑک پر سترہ میل دور لوکن ہالی ہے۔ مزید تیرہ میل آگے بیلور آتا ہے اور پھر ڈیم بیم کی پہاڑیاں کولیگل سے ۵۲ میل دور ہیں۔

چوتھی سڑک جنوب مشرق کی سمت جاتی ہے اور ۲۵ میل دور رام پرم سے گزرتی ہے اور پھر جنوب کو مڑ کر ۲۴ میل دور بار گر کو جاتی ہے۔ آگے یہ سڑک پانچ میل بعد تمارا کرائی سے گزرتی

ہے اور پھر نیچے ڈھلوان سے اتر کر اندیور کے دیہات کو جاتی ہے۔ اس سڑک کی کل لمبائی ۸۱ میل ہے۔

کولیگل سے لوکن ہالی، بیلور اور ڈیم بیم جانے والی سڑک پر اکا دکا لاریاں اور روزانہ ایک بس بھی چلتی ہے۔ راماپرم، تمارا کرائی اور اندیور والی سڑک پر مشینی ٹریفک نہیں چل سکتی اور یہاں آخری ساٹھ میل کے فاصلے پر محض جیپیں یا پرانی اور اونچی امریکی کاریں گزر سکتی ہیں۔ سارا علاقہ بہت خطرناک ہے اور چڑھائی اترائی کے علاوہ سڑک پر جگہ جگہ بڑے پتھر بھی عام ہوتے ہیں۔ یہ بہت تنگ ہے اور درمیان میں بیل گاڑیوں کے پہیوں سے زمین کٹی ہوئی ہے اور دونوں کناروں پر گھنا جنگل ہے۔ اس راستے پر جگہ جگہ پہاڑی نالے گزرتے ہیں جن کی سطح ریتلی اور پتھریلی ہوتی ہے۔ گہری وادیوں میں بہت بڑے بانس کے درخت ملتے ہیں جن کے جھکے ہوئے تنوں کے نیچے کار کو پہلے یا دوسرے گیئر میں چلانا پڑتا ہے اور انجن بہت جلدی گرم ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھار بانس کی شاخ یا تنے سڑک پر پڑے ملتے ہیں جو ہاتھیوں نے پیٹ بھرنے کی خاطر گرائے ہوتے ہیں۔ ایسے مقامات پر ڈرائیور کو رک کر کلہاڑی وغیرہ سے اسے کاٹ کر راستے سے ہٹانا پڑتا ہے۔ سارا راستہ جگہ جگہ یہی ہوتا ہے۔

شیروں کو بہت گھنے جنگل پسند نہیں اور وہ کم گھنے جنگل میں رہتے ہیں۔ تاہم ہاتھی اور بائسن کو یہ جنگل بہت پسند ہوتے ہیں۔ شیروں کو ایسا جنگل اس لیے ناپسند ہوتا ہے کہ جھاڑیوں وغیرہ میں اسے اپنے شکار پر گھات لگا کر جانے کا موقع نہیں ملتا اور جست لگانا بھی مشکل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ شیروں کی عام خوراک یعنی ہرن، جنگلی سور اور مویشی وغیرہ ایسے جنگل میں نہیں جاتے۔ اس کے علاوہ یہاں ہاتھی اور بائسن پائے جاتے ہیں جنہیں شیر پسند نہیں کرتا۔ تیسری وجہ یہ بھی

ہے کہ ان جنگلوں میں جونک اور دیگر زہریلے یا نقصان دہ حشرات بکثرت ملتے ہیں جن سے شیر ہر ممکن طور پر کتراتا ہے۔

راما پرم کے آدم خور کے بارے مشہور تھا کہ وہ دریائے کاویری کے کنارے چھ ہزار فٹ اونچی پوناچائی ملائی سے آیا تھا۔ اس جگہ چند چھوٹی موٹی کافی کے باغات موجود تھے جن کے مالکان یا تو شلوگا تھے یا پھر مقامی ہندوستانی۔ یہ سب اسی پہاڑ کی ڈھلوان پر قائم تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس آدم خور نے پہلے پہل انہی لوگوں کے مویشیوں کو کھانا شروع کیا۔ اس نے بہت سارے مویشی مار کھائے۔ ایک بار ایک مقامی کاشتکار کومبتور گیا اور وہاں سے ایک خوفناک شکنجہ خرید لایا۔

یہ شکنجہ فولادی تھا اور نیم قوش نما شکل تھی۔ جب اسے کھولا جاتا تو اڑھائی فٹ پھیل جاتا۔ اس کے دانت دو دو انچ لمبے تھے۔ جب کوئی چیز اس کو چھوتی تو شور کرتے ہوئے بجلی کی سی تیزی سے یہ شکنجہ بند ہو جاتا۔

جلد ہی شیر نے ایک دودھیل گائے ماری اور اسے گھسیٹ کر ایک کھائی میں لے گیا اور کھائے بنا خشک پتوں کے ڈھیر کے نیچے چھپا دیا۔ اس کا پیچھا کر کے گائے کی پچھلی ٹانگوں کے نیچے ایسی جگہ یہ شکنجہ لگا دیا گیا جہاں واپسی پر شیر کھانا شروع کرتا۔ اس کے اوپر خشک پتے بچھا کر اسے چھپا دیا گیا۔ شیر واپس لوٹا اور بدقسمتی سے اس کا سر شکنجے میں کانوں کے پیچھے تک پھنس گیا۔

شکنجے کو ایک کھونٹے سے باندھا گیا تھا جسے شیر نے اکھاڑ لیا۔ پھر شیر جنگل کو بھاگا اور شکنجہ اس کے سر پر لگا ہوا تھا۔ لگ بھگ دو میل دور جا کر شکنجہ دو بڑے پتھروں کے درمیان پھنس گیا۔ شیر نے زور لگا کر اپنا سر نکالنے کی کوشش کی مگر شکنجہ مزید سخت ہوتا گیا۔

شیر تکلیف سے دھاڑتا رہا اور آزاد ہونے کی کوشش کرتا رہا۔ نصف رات کو شیر کی دھاڑیں اسی کاشتکار اور قلیوں نے سنیں جو وہاں سے دو میل دور تھے۔ آخر کار شیر شکنجے سے نکلنے میں کامیاب تو ہوا مگر اس کا بائیاں کان اور بائیں آنکھ شکنجے میں ہی رہ گئے۔ اس کے علاوہ گردن اور چہرے پر گہرے زخم آئے۔ پورے ایک ہفتے تک شیر کے درد سے دھاڑنے کی آوازیں دن رات سنائی دیتی رہیں۔

پھر اچانک خاموشی چھا گئی۔ سب کا یہی خیال تھا کہ شیر مر گیا ہوگا۔ کاشتکار اور اس کے ملازمین نے گِدھوں پر نگاہ رکھی تاکہ شیر کی لاش تلاش کرنے میں آسانی ہو۔ تاہم گِدھ آسمان پر اڑتے دکھائی دیتے رہے، نیچے نہ اترے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ شیر مرا نہیں تھا۔

دو ہفتے گزر گئے۔ ایک سہ پہر کو ایک شلوگا اپنی اٹھارہ سالہ بیوی کے ساتھ راستے سے جا رہا تھا۔ ہندوستانی رسوم کے مطابق شوہر آگے اور بیوی اپنے سر پر غلے کا تھیلا رکھے ایک گز پیچھے چل رہی تھی۔ انہوں نے ایک خشک ندی عبور کی اور دوسرے کنارے پر چڑھنے لگے کہ اچانک اونچی گھاس سے ایک شیر نے جست لگا کر بیوی کو زمین پر گرا دیا۔

جب شلوگا نے مڑ کر دیکھا تو اسے بیوی زمین پر پڑی دکھائی دی جس کے اوپر شیر کھڑا تھا۔ شیر کے اگلے پنجے اس کی بیوی کے کندھوں پر جبکہ منہ اس کے عین سر پر تھا۔ اس شیر کی بائیں آنکھ اور بائیاں کان غائب تھے۔ گردن اور چہرے کے زخم ابھی تک نہیں بھرے تھے۔

دہشت سے شلوگا پتھر ہو کر نہ ہل سکا نہ ہی کچھ بول سکا۔ شیر نے غصے سے دھاڑ لگائی جس سے اس کا زخمی چہرہ اور بھی خوفناک لگنے لگا۔ پھر اس نے لڑکی کو دائیں شانے سے پکڑا اور اٹھا کر ندی میں

چل دیا۔ لڑکی کا سر نیچے اور بال لٹک رہے تھے۔ بائیاں بازو اور ٹانگ جھولتے جا رہے تھے۔ اگلے ہی لمحے شیر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

بدقسمت لڑکی مر چکی تھی۔ شلوگا نے اپنی بیوی کو آخری بار دیکھا تھا۔ لڑکی نے حملے سے قبل یا اس کے درمیان بھی کوئی آواز نہیں نکالی تھی۔

ایک ماہ بعد راماپرم سے دو میل کے فاصلے پر مویشی چراتا ایک لڑکا مارا گیا۔ تاہم اس کی ادھ کھائی لاش جھاڑیوں سے برآمد ہو گئی۔ تین ہفتے بعد تیسری واردات کولیگل سے لوکن ہالی، بیلور اور ڈیم بیم جانے والی سڑک کے اکیسویں سنگِ میل پر ہوئی۔ اس بار شکار ایک قلی عورت تھی اور شام کو پانچ بجے دیگر افراد کے سامنے اس پر حملہ ہوا تھا۔ اس نے کام سے چند منٹ کا وقفہ لیا تھا کہ اچانک شیر کہیں سے نمودار ہوا اور اسے اٹھا کر بھاگ نکلا۔ عورت نے بہت واویلا کیا اور اس جگہ موجود دیگر افراد نے شیر کو دیکھا۔ اس شیر کے چہرے پر زخم تھے اور بائیں آنکھ اور بائیں کان غائب تھے۔

اتفاق کی بات دیکھیے کہ انہی دنوں شمالی کومبتور میں شکار کے لیے میرا اجازت نامہ ختم ہوا تھا۔ یہ علاقہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ شمالی کومبتور اور کولیگل۔ کولیگل اگرچہ شمالی کومبتور کا ہی حصہ ہے مگر انتظامی وجوہات کی بنا پر محکمہ جنگلات نے اس علاقے کے دو حصے کر دیے ہیں۔ میرا لائسنس جو زائد المیاد ہوا تھا، وہ شمالی کومبتور اور ڈیم بیم سے متعلق تھا جبکہ لوکان ہالی، بیلور اور راماپرم کولیگال کا حصہ تھے۔ میرا ارادہ تھا کہ اس لائسنس کی تجدید کراؤں اور اس مقصد کے لیے میں مطلوبہ رقم بھیجنے ہی والا تھا کہ اخبارات میں آدم خور کی آخری واردات کی خبر پڑھی۔ میرے پاس دس روز کی چھٹی باقی تھی۔ سو اگلی صبح میں بنگلور سے نکلا اور سیدھا ۸۷ میل دور کولیگل کے

فارسٹ ڈپارٹمنٹ افسر کے پاس جا پہنچا۔ ابھی دفتر بند ہی تھا۔ تاہم جب دفتر کھلا تو میں نے تھوڑی ہی دیر میں نہ صرف لائسنس کی تجدید کرائی بلکہ آدم خور سے متعلق بھی تمام تر معلومات حاصل کر لیں۔

آدم خور جس علاقے میں سرگرم تھا، وہ میرے لیے اجنبی تھا۔ سو میں نے سوچا کہ راماپرم کے چھوٹے سے فارسٹ لاج سے آغاز کروں جو یہاں سے ۲۵ میل دور تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے میں دشوار گزار سڑک عبور کر کے میں وہاں جا پہنچا۔

سب سے پہلا کام تو یہی تھا کہ میں مقامی افراد سے مل کر انہیں بتاؤں کہ میں شیر کی ہلاکت کے سلسلے میں آیا ہوں۔ لوگ مجھے نہیں جانتے تھے اور ان سے ملنے والی معلومات بھی غلط سلط تھیں۔ ان کے خیال میں پہلی واردات والی جگہ یعنی پونچائی ملائی اور آخری واردات بیلور کے درمیان شیر کہیں بھی ہو سکتا ہے۔ سیدھے خط میں دونوں مقامات ساٹھ میل دور تھے۔

بیلور کولیگال سے تیس میل دور تھا۔ سو ایک صورت تو یہ تھی کہ میں کولیگل تک کار پر جا کر پھر بیلور کا رخ کروں یا پھر راماپرم سے بیلو پیدل جاؤں جو کل ۱۹ میل بنتے۔ میں نے دوسرے راستے کو چنا کہ اس طرح میں راستے میں بے شمار آبادیوں سے گزرتا اور شیر کے بارے کوئی نہ کوئی خبر مل جاتی۔

اگلی صبح میں فارسٹ لاج سے نکلا اور بیلور کو روانہ ہوا۔ راستہ لگ بھگ جنوب مغرب کی سمت جا رہا تھا۔ جگہ جگہ مزروعہ زمین اور پھر جنگل اور پھر مزروعہ زمین تھی۔ راستہ دو میل دور جنوب موجود پہاڑیوں سے ہٹ کر جا رہا تھا اور محفوظ جنگل سے گزرتا تھا۔

میں راستے میں کئی آبادیوں سے گزرا مگر ہر جگہ یا تو لوگ گھروں میں بند تھے یا پھر گھروں کے سامنے بیٹھے تھے۔ مویشی بھی آبادی کے اندر یا آبادی کے کنارے چر رہے تھے۔ دور دور تک آدم خور کی خبر پھیل چکی تھی۔

میں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے آبادیوں سے پوچھ تاچھ کرتا گیا۔ تقریباً تمام شلوگا یہی کہتے کہ شیر یا تو پچھلی رات وہاں تھا یا پچھلے تین روز میں اس کی آواز سنائی دی تھی۔ ایک جگہ تو ایک بندے نے اپنے جھونپڑے سے سو گز دور ہل چلے ہوئے کھیت میں شیر کے پگ دکھائے۔ میں نے پوری توجہ سے ان کی پیمائش کی۔ تاہم یا تو یہ سب لوگ بہت خوفزدہ تھے یا پھر یہاں بہت زیادہ شیر پائے جاتے ہوں گے کہ پچھلے تین یا چار روز میں شیر ہر آبادی سے گزرا تھا۔

چار بجے میں بیلور پہنچا جو بیس گھروں پر مشتمل ایک بستی تھی۔ یہاں مجھے آدم خور کی آخری واردات کے چشم دید گواہان سے ملاقات کا موقع ملا۔ سب نے مجھے شیر کی ایک آنکھ اور ایک کان کے بارے بتایا کہ وہ سب اس مقام کے پاس ہی تھے جہاں آخری شکار مارا گیا تھا۔

نزدیک ترین فارسٹ لاج یہاں سے ساڑھے تین میل دور ڈیم بیم کی سمت تھا۔ سڑک کے دونوں جانب محفوظ جنگل تھا۔ اب ساڑھے پانچ بج رہے تھے اور گھنٹے بھر میں اندھیرا ہو جاتا۔ سو میں نے باقی کے ساڑھے تین میل تیزی سے طے کیے اور اندھیرا چھانے سے ذرا قبل فارسٹ لاج پہنچ گیا۔

سورج تین میل دور مغرب کی سمت بلی گیریر نگن پہاڑیوں کے پیچھے کافی دیر سے چھپ چکا تھا اور جنگلی مرغوں اور موروں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں آرام کرسی کھینچ کر برآمدے میں بیٹھ گیا۔ دور سے مجھے سانبھر کی آواز سنائی دی جو مغربی پہاڑی سے اتر رہا تھا۔ جنگل اتنا گھنا تھا کہ جیسے قالین سا بچھا ہو۔

آدھے گھنٹے بعد پوری طرح تاریکی چھا گئی جس میں بے شمار جگنو چمکتے دکھائی دیے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا کہ یہ سب ایک ساتھ چمکتے اور آس پاس کا ماحول لمحہ بھر کو روشن ہو جاتا۔

میں رات کو جلدی سو گیا۔ میرا بستر مرکزی کمرے کے فرش پر تھا۔ رات کو دو بجے مجھے کی دھاڑ سنائی دی اور وقفے وقفے سے بولتا ہوا شیر وادی سے گزر گیا۔

اگلی صبح میں بیلور واپس پہنچا اور دو مقامی شکاریوں کو ملازم رکھا اور تین بچھڑے بھی خرید لیے۔ ایک بچھڑا فارسٹ لاج سے مغرب کی جانب ندی پر باندھا گیا جہاں سے رات کو شیر گزرا تھا۔ دوسرا بیلور اور فارسٹ لاج کے درمیان سڑک سے سو گز دور ایک کھلی جگہ باندھا گیا۔ تیسرے کو ہم نے ۲۱ویں سنگ میل پر باندھا جہاں قلی خاتون ماری گئی تھی۔ اس جگہ ایک ندی پاس سے گزرتی تھی۔ اس ندی کا نام اودم بٹہ ہلا تھا اور اس کے کنارے بانس کے گھنے جنگل تھے۔ ایک جگہ کچھ زمین خالی کر کے محکمہ جنگلات نے تجرباتی بنیادوں پر کچھ بیج لگائے تھے۔ میرے ہمراہیوں نے بتایا کہ شیر اکثر اس جگہ سے گزرتا ہے۔ یہاں میں نے شیر کے تازہ اور پرانے ہر قسم کے پگ دیکھے۔ میں نے ان کی پیمائش بھی کی۔ کل والے اور یہ دونوں نشانات نر شیروں کے تھے مگر یہ والے زیادہ بڑے اور بھاری جانور کے تھے۔

تیسرا بچھڑا اس مقام پر باندھا گیا جہاں اودم بٹہ ہلا اس جگہ کے قریب سے گزرتی ہے۔

فارغ ہوتے ہوتے ساڑھے پانچ بج گئے۔ سو ہم بیلور واپس لوٹے۔ یہاں مجھے ایک مضبوط ہاتھ پیر اور اچھی شکل کا شلوگا ملا جس نے اپنا نام جیکن بتایا۔ یہ بندہ آدم خور کی پہلی شکار کردہ لڑکی کا شوہر تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ پونچائی ملائی کی ایک کافی اسٹیٹ پر کام کرتا ہے۔ وہاں سے کچھ لوگ گزرے تو انہوں نے بتایا کہ ایک صاحب راماپرم آئے ہوئے ہیں جو آدم خور کو مارنا چاہتے ہیں۔ سو اس

نے مالک سے اجازت لی اور سیدھا راماپرم پرم کا رخ کیا تاکہ اپنی بیوی کا بدلہ لے سکے۔ راماپرم سے اسے اطلاع ملی کہ میں بیلور ہوں۔ سو اس نے اکیلے ہی بیلور کا رخ کیا۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اسے فوراً ذاتی مددگار کے طور پر ملازم رکھ لیا۔ مجھے اس کی شکل و صورت اور گفتگو کا انداز پسند آیا۔ جیکن نے مسکرا کر مجھے بتایا کہ اس کی صرف ایک شرط ہے کہ وہ مجھ سے کسی قسم کا معاوضہ نہیں لے گا۔

میں فارسٹ لاج لوٹا اور جیکن اور دیگر دو مددگاروں کو کہہ آیا تھا کہ اگلی صبح وہ ۲۱ ویں سنگِ میل والے بچھڑے کو دیکھ آئیں۔ باقی دونوں میں خود دیکھتا۔ اگلی صبح میں پہلے وادی میں ندی کنارے بندھے اور پھر دوسرے بچھڑے کو دیکھا۔ دونوں صحیح سلامت تھے اور نہ ہی کوئی پگ دکھائی دیے۔

جب میں واپس بیلور پہنچا تو میرے تینوں ہمراہی کچھ دیر بعد لوٹے اور بتایا کہ تیسرا بچھڑا بھی سلامت تھا۔

جیکن اور ایک شلوگا کو گاؤں میں ہی چھوڑ کر میں دوسرے شلوگا کے ساتھ نکلا اور ارادہ تھا کہ آس پاس کے جنگل سے کچھ واقفیت پیدا کروں گا۔ ہم پہلے مغرب کو بلی گیریرنگن پہاڑیوں کے دامن کی طرف گئے۔ یہ سارا علاقہ میرے لیے نیا تھا۔ اس لیے میں نے اس بندے کو اپنے آگے چلنے کا کہا اور خود اس کے پیچھے رائفل ہاتھوں میں تیار لیے چل پڑا۔ شلوگا پیدائشی شکاری ہوتے ہیں، سو اس بندے کو کوئی الجھن یا فکر نہ تھی کہ وہ میرے آگے چل رہا ہے۔ ہم کبھی ایک پگڈنڈی پر چلتے تو کبھی دوسری پر۔ کبھی ہم کسی تاریک نالے کو عبور کرتے جہاں ہمیں اکثر جھک کر چلنا پڑتا کہ درخت جھکے ہوئے ہوتے تھے یا خاردار جھاڑیاں ہوتیں۔ تاہم شیر کے تازہ پگ کہیں نہیں ملے۔

ایک مقام پر ایک بڑے نر تیندوے نے نالہ عبور کیا تھا اور آگے چل کر ایک مادہ چیتیا بھی اپنے بچے کے ساتھ گزری تھی۔ تاہم شیر اس جگہ سے نہیں گزرا تھا۔

تین بجنے والے تھے کہ ہم فارسٹ لاج پہنچے اور ٹھنڈا کھانا کھایا۔ شلوگا نے آگ جلائی اور ہم نے چائے تیار کی۔ پھر میں نے صحن کے کنویں سے پانی نکالا اور ٹھنڈا غسل کیا۔

پانچ بجے میں شلوگا کے ساتھ بیلور کو لوٹا جہاں میں نے اسے اور جیکن کو ہدایت کی کہ تیسرے شلوگا کو ساتھ لے کر اگلی صبح ۲۱ویں سنگِ میل والے بچھڑے کو جا کر دیکھے۔ یہ رات میں نے سکون سے سو کر گزاری کہ شیر کی آواز نہ آئی۔ اگلی صبح میں دونوں بچھڑوں کو دیکھنے گیا تو دونوں ہی سلامت تھے۔

فارسٹ لاج کو لوٹ کر میں نے کچھ کھانا کھایا اور پھر بیلور کو چل دیا۔ راستے میں شیر کے پگوں کو دیکھتا گیا۔ تاہم اس راستے سے شیر نہیں گزرا تھا اور سوا نو بجے میں بیلور پہنچ گیا۔ میرے تینوں ساتھی دس بجے سے پہلے لوٹے اور بتایا کہ ایک شیر نے بچھڑا ہلاک کیا اور رسی کتر کر اسے اٹھا لے گیا۔

خوش قسمتی سے میں ایسی صورتحال کے لیے تیار ہو کر آیا تھا اور میرے پاس ٹارچ اور رات کے شکار کے لیے تمام تر سامان تھیلے میں موجود تھا۔ ہر ممکن تیزی سے ہم لوگ نکلے اور جائے وقوعہ پر جا پہنچے۔ وہاں پہنچ کر ہمیں پگ دکھائی دیے جس مقام چل کر شیر بیس فٹ دور بچھڑے تک پہنچا۔ تاہم یہ پگ شیر کے نہیں بلکہ شیرنی کے تھے۔ اس نے جست لگا کر بچھڑے کو ہلاک کیا اور بچھڑے کی ٹانگ سے بندھی رسی کو کتر دیا۔

ہمیں علم نہیں تھا کہ شیرنی اپنے شکار کو کتنی دور لے گئی ہو گی، سو میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ تین بجے تک ۱۲ویں سنگِ میل پر رک کر میرا انتظار کریں۔ پھر میں گھسیٹنے کے نشانات کے پیچھے چلا۔ اگر شیرنی اپنے شکار کو دور لے گئی ہوتی تو میں وہیں کوئی کمین گاہ بنا کر بیٹھ جاتا اور ساری رات وہیں گزرتی۔ اس لیے میں تین بجے واپس نہ لوٹ سکتا۔ سو میرے ساتھی تین بجے بیلور لوٹ جاتے۔ تاہم اگر شیرنی کا شکار زیادہ دور نہ ہوتا تو میں واپس آ کر انہیں ساتھ لے جاتا اور ہم مچان بناتے۔

میں نے دیکھا کہ پہلے دو سو گز تک شیرنی نے بھینسے کو کچھ اٹھایا اور کچھ گھسیٹا۔ جب ندی کے پار بانس کا جنگل ختم ہو گیا تو شیرنی نے امبل کے گھنے اور خار دار جھاڑیوں کے سلسلے کا رخ کیا۔ یہاں سے گزرتے ہوئے اسے بچھڑے کی لاش کے ساتھ کافی مشکل ہوئی۔ اس جگہ سے شیرنی نے بچھڑے کو اپنے شانے پر لاد لیا۔ شیر بعض اوقات ایسا بھی کرتے ہیں۔ اس جگہ سے آگے تعاقب کافی مشکل ہو گیا۔

بچھڑے کے کھر یا سینگ سے کہیں کوئی ٹہنی ٹوٹتی تو اس سے شیرنی کی گزرگاہ کا پتہ چلتا۔ زمین پر گلتی سڑتی نباتات کا ڈھیر تھا، سو وہاں پگ کی تلاش بیکار تھی۔ میری پیش قدمی کافی سست تھی اور نہ ہی یہ مقام مجھے پسند تھا کہ ساری توجہ نشانات کی تلاش پر مرکوز تھی اور اگر آدم خور حملہ کرتا تو میں اپنا بچاؤ نہ کر پاتا۔ آخر کار امبل ختم ہوئی اور نسبتاً کھلا جنگل آ گیا۔ یہاں درخت اور پست قامت کھجور کے درخت تھے۔

دو بار مجھے ایسے نشانات ملے کہ شیرنی نے بچھڑے کو نیچے اتار کر آرام کیا اور پھر اسے اٹھا کر چل پڑی۔ ظاہر تھا کہ شیرنی کے ذہن میں کوئی خاص مقام ہے۔ شاید وہ بچھڑے کو اپنے بچوں کے لیے لے جا رہی ہو۔

نشانات آگے جاتے رہے اور راستہ پتھریلا ہوتا گیا۔ آخر کار مجھے درختوں کے بیچ پہاڑی دکھائی دی جو شاید وہاں سے چوتھائی میل دور اور دو سو فٹ اونچی ہو گی۔ شیرنی کے نشانات سیدھا اسی جانب جاتے دکھائی دیے۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ یہ آدم خور نہیں۔ آدم خور کے بارے تمام تر معلومات یہی تھیں کہ وہ مادہ نہیں بلکہ نر شیر ہے مگر اس بارے سو فیصد یقین سے کچھ کہنا دشوار تھا۔ آدم خور کے بارے یہ بات یقینی تھی کہ اس کی بائیں آنکھ اور بائیاں کان غائب تھے۔ اگر میں اس شیرنی کو ایک نگاہ دیکھ لیتا تو واضح ہو جاتا کہ وہ آدم خور ہے یا نہیں۔

تاہم یہ جھلک کیسے دکھائی دے، یہ بات قابلِ غور تھی۔ مجھے اس وقت تک پیش قدمی جاری رکھنی تھی جب تک کہ شیرنی دکھائی نہ دے جاتی۔ مجھے یہ طریقہ پسند نہیں تھا کہ شیرنی اگر آدم خور نہ بھی ہوتی تو بھی اسے اپنے غار اور بچوں کے قریب انسانی موجودگی ہر گز پسند نہ آتی۔

میری پیش قدمی جاری رہی اور کام آسان تر ہوتا گیا کہ شیرنی اب پتھروں اور چٹانوں سے ٹکراتے ہوئے گزر رہی تھی اور مردہ بچھڑے کے خون کے نشانات جا بجا تھے۔

میں پہاڑی پر آدھے فاصلے تک چڑھ چکا تھا۔ بڑے بڑے پتھر پھیلے ہوئے تھے اور شیرنی کے گزرنے کا راستہ بل کھاتے ہوئے ان کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ تین بجنے میں دس منٹ باقی تھے اور پتھر دھوپ سے جل رہے تھے۔ میرے کپڑے پسینے میں بھیگے تھے اور پورے جسم سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ میں نے ہونٹوں پر زبان پھیری تو نمکین پسینہ محسوس ہوا۔

میرے ربر کے جوتے بالکل بے آواز تھے۔ ہر موڑ کو عبور کرتے ہوئے محتاط ہونا پڑتا تھا مبادا کہ شیرنی سامنے ہو۔ آگے چل کر مجھے اوپر کو ابھری ہوئی ایک چٹان دکھائی دی جو غار تو نہیں تھی مگر غار نما دکھائی دے رہی تھی۔ یہاں دھاری دار دو گول مٹول سے بچے دکھائی دیے جو ایک دوسرے سے کھیل رہے تھے۔ یہ شیرنی کے بچے تھے۔

میں وہیں رکا اور رائفل کا گھوڑا چڑھایا۔ ہلکی سی آواز پیدا ہوئی۔ شیرنی کے بچے اگرچہ بہت چھوٹے تھے مگر انہیں فوراً خطرے کا احساس ہو گیا۔ انہوں نے اپنا کھیل روک دیا اور مجھے حیرانی سے دیکھنے لگے۔

مجھے ابھی تک وہ منظر یاد ہے۔ ایک بچہ مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا جبکہ دوسرا غصے سے۔ اس کے منہ سے پھنکار نکلی اور شیرنی جاگ گئی۔ دھاڑتے ہوئے اس نے غار سے جست لگائی اور سیدھا بچوں کے اوپر سے ہوتی ہوئی میرے سامنے آئی۔ ہمارا درمیانی فاصلہ بمشکل بیس گز ہو گا۔ میں نے اس کی پیشانی کا نشانہ لیا کہ وہ میری طرف چلتی آ رہی تھی۔ پانچ گز چل کر وہ رکی اور پیٹ زمین کو چھونے لگا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور اس کی دھاڑ سے زمین ہل رہی تھی۔ یہ آدم خور نہیں تھی۔

حیرت کی بات دیکھیے کہ اس نے حملہ نہیں کیا۔ شاید آخری لمحے اس کی ہمت جواب دے گئی۔ شاید وہ محض دھمکا رہی ہو کہ میرے بچوں کو نقصان نہ پہنچانا، ورنہ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔

ظاہر ہے کہ میں اس کو نہیں مار سکتا تھا۔ سو میں نے الٹے قدموں چلنا شروع کیا تاہم رائفل سے شیرنی کا نشانہ لیے رکھا۔ اس دوران شیرنی نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ شاید اسے اندازہ ہو

گیا تھا کہ میں اسے نقصان پہنچائے بغیر جا رہا ہوں۔ شیرنی محض اپنے بچوں کو بچا رہی تھی۔ شاید شیرنی خوفزدہ تھی۔ خوفزدہ تو میں بھی کافی تھا۔ تاہم میں نے اسے نقصان پہنچانے سے گریز کیا۔ میں الٹے قدم چلتا رہا اور شیرنی دھاڑتی رہی۔ جب میں پہلا موڑ مڑا تو شیرنی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس دوران میں نے بعجلت اپنے پیچھے دیکھا کہاں جا رہا ہوں۔ شیرنی نے دھاڑنا تو بند کر دیا تھا مگر غرائے جا رہی تھی۔ مجھے علم تھا کہ جب تک شیرنی بولتی رہے گی، میں محفوظ رہوں گا کہ مجھے شیرنی کے مقام کا علم رہے گا۔

ایک اور بڑے پتھر کے پاس سے گزرنے کے بعد میں نے رخ موڑا اور رفتار تیز کر دی۔ شیرنی نے غرانا بند کر دیا تھا، سو اب خطرہ پیدا ہو رہا تھا کہ شیرنی کہیں حملے کا نہ سوچ لے۔ عین ممکن ہے کہ شیرنی بچوں کے پاس چلی گئی ہو یا پھر میرا پیچھا شروع کر دیا ہو۔ ہر ممکن تیزی سے میں نیچے اترا اور بار بار مڑ کر پیچھے دیکھتا جاتا۔ جلد ہی درخت اور جنگل شروع ہوا اور پھر امبل کی جھاڑیاں اور پھر بانس کے جنگل سے ہوتے ہوئے میں سڑک تک جا پہنچا۔

ساڑھے چار بج رہے تھے اور میرے ساتھی حسبِ وعدہ بیلور جا چکے تھے۔ میں نے ابھی مزید نو میل کا سفر طے کرنا تھا اور میرے پاس بمشکل دو گھنٹے کی روشنی تھی۔ تاہم پانچ منٹ سڑک کے کنارے بیٹھ کر میں نے سگریٹ پی۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ مجھے اس شیرنی پر گولی نہیں چلانی پڑی۔

ساڑھے چھ بجے کے بعد میں بیلور پہنچا۔ میرے تینوں ساتھی وہیں تھے اور میری کہانی سننے کو بے قرار تھے۔ جب میں نے انہیں تفصیل بتائی تو وہ بھی حیران ہوئے کہ شیرنی نے حملہ کیوں نہیں کیا۔

جب میں بیلور سے نکلا تو تاریکی چھا چکی تھی۔ ابھی میرے سفر کا آخری مرحلہ باقی تھا۔ چونکہ ایک بچھڑا آدھے راستے پر بندھا تھا، سو میں نے اچانک سوچا کہ کیوں نہ اس بچھڑے کو دیکھتا چلوں۔ سڑک سے محض سو گز کے فاصلے پر ہی تھا۔ یہ خیال کیوں آیا، کہنا مشکل ہے۔ تاہم میں نے پوری زندگی اپنے خیالات کو سنتے گزاری ہے۔ سو اس بار بھی میں اسے رد نہ کر سکا۔ سڑک سے اتر کر میں پگڈنڈی پر چڑھا تو اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ ستاروں کی روشنی مدھم تھی اور آسمان صاف۔ میرے ارد گرد جھاڑیاں عجیب شکلیں اختیار کر چکی تھیں۔ کبھی ساگوان کا خشک پتہ اڑتا تو ایسی آواز آتی جیسے کوئی بڑا پتنگا اڑ رہا ہو۔

بچھڑا انجیر کے ایک چھوٹے درخت کے نیچے بندھا تھا۔ یہاں تاریکی اتنی گہری تھی کہ مجھے بھورے رنگ کا بھینسا نہ دکھائی دیا۔ جب میں بالکل قریب پہنچا تو بھینسا اچانک ہڑبڑا کر اٹھا تو میں چونکا۔ بچھڑا صحیح سالم تھا۔ میں نے اس کے دوسری جانب کا رخ کیا تاکہ اس کے پیر سے بندھی رسی کا جائزہ لے سکوں۔

عین اسی لمحے آدم خور نے حملہ کیا۔

خوش قسمتی سے بچھڑا میرے اور آدم خور کے درمیان تھا۔ تاہم یہ بات ماننے میں کوئی عار نہیں کہ آدم خور نے مجھے بے خبری میں آ لیا تھا۔

میں جنگل میں جس جگہ سے نکلا تھا، عین اسی جگہ سے 'ووف' کی آواز آئی۔ بچھڑا مڑا تو میں اس کے پیچھے دبک گیا۔ میرے پیچھے انجیر کا تنا تھا۔ ایک بہت بڑا سرمئی رنگ کا جسم مجھے بچھڑے کے اوپر دکھائی دیا جس کے وزن سے بچھڑا اچانک گر گیا۔

شیر نے بچھڑے کے گلے یا گردن کو نہیں پکڑا تھا بلکہ وہ محض اس کی پشت پر چڑھا تھا اور اگلے لمحے اس کی جست اسے میرے اوپر لے آتی، مگر بچھڑا جب گرا تو شیر کا توازن بگڑ گیا۔

جب شیر بچھڑے کے اوپر سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا تو میری گولی عین اس کی آنکھوں کے درمیان لگی۔ شیر کا جسم بچھڑے کی پشت پر مچلا اور بچھڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ شیر کا سر اور اگلا دھڑ نیچے لٹک رہا تھا۔

خود بخود اور سوچے بنا میں نے شیر کے بائیں شانے کے پیچھے دوسری گولی چلائی۔ بچھڑا گرا اور شیر لڑھک کر میری جانب بڑھا۔ میری تیسری گولی شیر کے گلے میں لگی۔

بچھڑا پھر نہ ہلا۔ شیر تڑپ رہا تھا۔ پھر ہر چیز ساکت ہو گئی۔

ٹارچ کی روشنی سے پتہ چلا کہ پہلی گولی نے شیر کی کھوپڑی کے پرخچے اڑا دیے تھے۔ دوسری گولی کافی نیچے گئی اور شیر کے سینے کے نچلے حصے سے ہوتی ہوئی بچھڑے کے جسم سے گزری۔ تیسری گولی غیر ضروری تھی اور شیر کے گلے سے گزری جہاں ایک بڑا سوراخ تھا۔ تاہم جس بچھڑے نے بلا ارادہ میری جان بچائی، میں نے اسے بھی ہلاک کر دیا تھا۔

میرے ہاتھ اور پیر کانپنے لگے اور اچانک کمزوری محسوس ہوئی۔ ایسے واقعات کے فوراً بعد حواس جواب دے جاتے ہیں۔ میں زمین پر بیٹھا اور انجیر کے درخت سے ٹیک لگا لی۔ جب میں نے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرا تو وہ یخ محسوس ہوا۔

یہاں میں کتنی دیر بیٹھا رہا، کہنا مشکل ہے۔ پھر میں نے پائپ نکال کر اسے بھرا اور سلگایا۔ پہلے چند کشوں نے میرے حواس مجتمع کرنے میں مدد کی۔ جلد ہی میں سڑک سے ہوتا ہوا بیلور کو چل پڑا۔

بیلور کے لوگ گلیوں میں جمع تھے اور بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ آس پاس کی پہاڑیوں کی وجہ سے رائفل کے دھماکے یہاں تک بخوبی سنائی دیے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بنگلے کو جاتے ہوئے مجھ پر حملہ ہوا ہوگا مگر وہ یہ سوچ رہے تھے کہ یہ حملہ آدم خور کا تھا یا ریچھ یا ہاتھی کا۔

جب میں اندھیرے سے نکلا تو یہ سب میری طرف بھاگے۔ میرے تینوں ساتھی سب سے آگے تھے۔ میں وہیں سڑک کے کنارے بیٹھ گیا اور پوری بات بتائی۔ ان لوگوں نے کہانی سنتے ہوئے پریشانی اور پھر شیر کی ہلاکت کا سن کر خوشی کا اظہار کیا اور یہ بھی کہ میں بچ گیا۔

تازہ اور گرم دودھ کی ایک چاٹی اور کیلے میرے سامنے رکھ دیے گئے۔ یہ تحفہ مادی اعتبار سے تو نہیں مگر ان لوگوں کے جذبات کے اعتبار سے بہت قیمتی تھا۔

نصف گھنٹے میں سارا گاؤں لالٹین اور مٹی کے تیل سے جلنے والی مشعلیں لے کر شیر کو لانے کو تیار ہو گئے۔ وہاں پہنچے تو منظر دیکھ کر لوگ بہت حیران ہوئے۔ افسوس کہ جیکن نے اپنا چاقو نکالا اور شیر پر وار کرنے لگا۔ کھال پہلے ہی کافی خراب ہو چکی تھی، سو میں نے سختی سے اسے پکڑ کر روکا۔ پھر وہ اپنی متوفیہ بیوی کا سوچ کر رونے لگا۔

جوان مرد کا رونا عجیب منظر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ آس پاس کے لوگوں کو بھی جذباتی کر دیتا ہے۔

اگلے روز عجیب بات دیکھیے کہ بنگلے کو آتے ہوئے جیکن اس جگہ پہنچا جہاں میں نے سڑک سے اتر کر بچھڑے کا رخ کیا تھا۔ وہاں جب وہ پیشاب کرنے کے لیے ایک جگہ رکا تو وہاں اسے شیر کے بیٹھے رہنے کے نشانات ملے۔ شاید شیر نے جب مجھے آتے دیکھا تو وہیں گھات لگا کر بیٹھ گیا۔

جیکن نے مجھے بتایا تو میں اس کے ساتھ خود یہ منظر دیکھنے آیا۔ شیر کے وہاں بیٹھے رہنے کے واضح نشانات تھے۔

بہت سے لوگ قسمت، مقدر، نگران فرشتوں یا چھٹی حس وغیرہ پر یقین نہیں رکھتے۔ مجھے ان لوگوں کی سوچ پر حیرت ہوتی ہے۔

مدیانور کا بڑا تیندوا

مدیانور دریائے مویار کے شمالی کنارے پر واقعی ایک زرخیز وادی کے جنوب مشرقی سرے میں واقع چھوٹی سی بستی ہے۔ یہ نیلگری یا نیلے پہاڑوں کے دامن میں واقع ہے۔ اس کے جنوب میں بلی گیریرنگم نامی نسبتاً چھوٹے پہاڑ ہیں۔

یہ وادی اتنی خوبصورت اور پرسکون ہے کہ جیسے خواب کا منظر ہو۔ یہاں بارش بکثرت ہوتی ہے کہ دونوں سروں پر پہاڑی سلسلے موجود ہیں جو بادلوں کو روک لیتے ہیں۔ زمین بہت زرخیز ہے اور مٹی چکنی ہونے کے علاوہ جنگل کی نباتات کے گلنے سڑنے سے بھی زرخیزی بڑھتی ہے۔ انسانی دست برد سے یہ علاقہ ابھی تک محفوظ رہا ہے۔ دن کے وقت موسم معتدل ہوتا ہے اور رات کو خنک ہو جاتا ہے کہ پہاڑوں سے آنے والی ہوا سرد ہوتی ہے۔

مدیانور کے زیادہ تر رہائشی کسان ہیں اور چند ایک مویشی چراتے ہیں اور ان کے پاس مویشیوں کے بہت بڑے ریوڑ ہیں۔ یہ مویشی دن کے وقت جنگل میں چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ ان کے دودھ سے دیسی گھی بنتا ہے جو پورے بھارت میں کھانے پکانے میں استعمال ہوتا ہے۔ گھی کو مٹی کے تیل کے ڈبوں میں بھر کر میسور سے ستیامنگلم کو بھیجا جاتا ہے۔ گھی کے ڈبے اکثر بیل گاڑیوں اور کبھی کبھار لاریوں پر لاد کر بھیجے جاتے ہیں۔ میسور اور ستیامنگلم میں ان کو بازار میں بیچا جاتا ہے۔

سو یہاں کی آبادی خوشحال اور مسرور رہتی ہے۔ اس وادی میں چند ہی اجنبی آتے ہیں اور راستہ ایسا ہے کہ اس پر موٹر کار نہیں چل سکتی۔

کبھی کبھار شیر یا تیندوے مویشیوں پر حملہ کر کے انہیں لقمہ تر بنا لیتے ہیں۔ بعض اوقات رات کے وقت جنگلی ہاتھی کھیتوں کو ملیامیٹ کر جاتے ہیں۔ جنگلی سور اور ہرن بھی فصلوں کو تباہ

کرتے رہتے ہیں مگر ان کے نقصان کو بہت زیادہ نقصان نہیں سمجھا جاتا اور اسے قسمت کا لکھا مان لیتے ہیں۔

اس کہانی کا نام ظاہر کرتا ہے کہ جس تیندوے کے بارے ہم بات کر رہے ہیں، وہ بہت بڑی جسامت کا حال تھا۔ اندازہ ہے کہ یہ تیندوا نیلگری مین شاید انیکتی یا سیگور سے دریائے مویار عبور کرکے یہاں آیا ہوگا۔ یا پھر شاید میسور سے آیا ہو۔ اس نے پہلے پہل مویشی مارنے شروع کیے اور اس کا طریقہ شیر کی مانند جانور کی گردن توڑ کر اسے ہلاک کرنا تھا۔ اس لیے کچھ عرصہ تو دیہاتی اسے شیر کی حرکت سمجھتے رہے۔

جوں جوں اس کی ہمت بڑھتی گئی، اس نے میرے دوست ہفی ہیل سٹون کی دودھیل گایوں سے بھی خراج وصول کرنا شروع کر دیا۔ اس کی زمینیں وادیٔ مویار میں ہیں اور ہفی بھی خوب انسان ہے۔ ہفی پیشے کے اعتبار سے عمدہ انجینیر ہے۔ اس کے علاوہ اچھا موجد بھی ہے اور کسی چیز کی قدر کو فوراً جان لیتا ہے۔ اس نے کئی چھوٹی موٹی ایجادیں کی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ عمدہ شکاری بھی ہے۔ اسے جنگل اور جنگلی جانوروں سے لگاؤ ہے اور ہتھیاروں کا بھی شوق رکھتا ہے۔ میشنوں اور شکار سے دلچسپی کی وجہ سے اس نے اپنی زمینوں کی شکل بدل کر رکھ دی ہے۔ اس کی زمینوں پر پہلے گھنے جنگل تھے۔

اس نے عظیم الجثہ درخت کٹوائے اور زمین کو صاف کیا۔ پھر اس نے ان درختوں سے کوئلہ بنایا اور لاریوں کی مدد سے دور دراز کے مقامات کو بھیج کر پیسے بنائے اور انہی پیسوں سے اینٹیں، پتھر، سیمنٹ، گارا اور عمارت کی تعمیر کے دیگر ساز و سامان منگوائے۔ بڑھئی بھی منگوائے گئے اور جنگل کی عمدہ لکڑی کو کوئلہ بنانے کی بجائے تعمیراتی مقصد کے لیے استعمال کیا گیا۔ جلد ہی جدید شکل کی

عمارت کھڑی ہو گئی۔ پون چکی سے اس نے بجلی پیدا کی اور گھر میں بجلی مہیا ہو گئی جہاں روشنی، ریفریجریٹر اور دیگر جدید آسائشیں موجود تھیں۔ اس کے علاوہ اس نے زرعی مشینری بھی منگوائی اور بہترین رینچ بنا لیا۔

ہفی اپنی تجارتی مصروفیات کی بنا پر باہر بھی جاتا رہتا ہے۔ کئی بار چند ہفتے بعد تو کئی بار چند ماہ بعد واپسی ہوتی ہے۔ یہ کہانی اس کی طویل غیر حاضری سے متعلق ہے۔ اس نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ وقتاً فوقتاً میں اس کے فارم کا چکر لگا کر اس کے مویشیوں کی خیر خیریت دریافت کرتا رہوں۔ سو ایک دن مجھے ہفی کے ملازم کا خط ملا کہ ایک بڑے تیندوے نے ہفی کے بہترین السیشن کتے کو مار ڈالا ہے۔ اس بندے کا نام ور گھیس تھا۔

تب میں کافی مصروف تھا اور اگلے دو ہفتوں تک وقت نکالنا ممکن نہ تھا۔ ور گھیس کا خط عام ڈاک سے آیا تھا اور یہاں پہنچنے میں چھ دن لگے۔ اتفاق سے میرا بیٹا ڈونلڈ فارغ تھا، سو میں نے تیندوے کا شکار اس کے ذمے لگا دیا۔ سٹڈ بیکر کا ایکسل ایک ماہ سے ٹوٹا ہوا تھا اور نیا ایکسل بمبئی سے ابھی تک نہ پہنچا تھا۔ سو ڈونلڈ نے اپنے دوست کا رخ کیا تاکہ اس کی کار مانگ سکے۔

یہاں سے میں ڈونلڈ کے الفاظ میں کہانی بیان کرتا ہوں کہ میرا کام اس کہانی میں یہیں ختم ہو جاتا ہے۔

'جب ڈیڈ نے مجھے مدیانور جانے کا کہا تو سب سے پہلا مسئلہ گاڑی کا انتظام تھا کہ ان کی کار خراب پڑی تھی۔ سو میں نے فوراً اپنے پرانے دوست رستم دودھ والا کا رخ کیا۔ رستم کے پاس تین چار کاریں ہیں۔ سو ہلکی سی گپ شپ کے بعد رستم میرے ساتھ جانے پر تیار ہو گیا۔ مجھے مطلوبہ ساز و سامان جمع کرنے میں چار گھنٹے لگے۔ اس کے علاوہ میں نے اپنے والد سے شیر کے شکار کا تعویذ بھی مانگ

لیا۔ مجھے علم ہے کہ وہ اس کا تذکرہ نہیں کرتے کہ لوگ مذاق اڑائیں گے مگر وہ اس پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ یہ تعویذ انہیں بدھیا نامی ایک بندے نے دیا تھا۔ یہ تعویذ بانس کے چھوٹے سے ٹکڑے میں بند کر کے ہاتھی کی دم کے بال سے باندھا گیا ہے۔ اسے گلے میں بھی ڈال سکتے ہیں مگر میرے والد اسے عموماً اپنی جیب میں رکھتے ہیں۔

روانگی سے ذرا قبل میں نے ایک اور دوست سیڈرک بون کو بھی ساتھ لینے کا سوچا۔ اسے فوٹو کھینچنے کا جنون ہے اور اچھا شکاری بھی ہے۔ وہ فوراً ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔ میرے پاس اپنی ماؤزر اعشاریہ ۴۲۳ بور کی رائفل تھی جو والد کی پرانی اعشاریہ ۴۰۵ ونچسٹر سے بدرجہا بہتر ہے۔ بوڑھے افراد ہمیشہ پرانی چیزوں سے لگاؤ رکھتے ہیں حالانکہ میرے والد کو بخوبی علم ہے کہ میری رائفل ان کی رائفل سے کہیں بہتر ہے۔ اس کے علاوہ میں نے اعشاریہ ۳۰۰۶ سپرنگ فیلڈ رائفل کو بھی ساتھ لے لیا تاکہ ہرن وغیرہ مار سکوں۔ میرے والد کو ہرن وغیرہ کا شکار برا لگتا ہے اور ہمیشہ نصیحتیں کرتے ہیں۔ جب وہ ساتھ ہوں تو ایسا شکار یکسر ممنوع ہوتا ہے۔ تاہم اس بار وہ ساتھ نہیں تھے تو ظاہر ہے کہ ان کی نصیحت میں کیوں سنتا۔

مدیانور تک کے آخری سترہ میل کا سفر بہت مشکل ہے اور ہمیں اس سفر پر آٹھ گھنٹے لگ گئے۔ ورگھیس ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوا مگر اس کے انداز سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ میرے والد کے نہ آنے پر مایوس ہوا ہے۔ عجیب بات ہے کہ آج کل لوگ نوجوانوں پر بھروسہ نہیں کرتے حالانکہ وہ بھی اس عمر سے گزرے ہیں۔

خیر، ورگھیس نے ہمیں بتایا کہ گاؤں کے دیگر مویشیوں کے علاوہ اس تیندوے نے ہیل سٹون کی بھی ایک گائے تین روز قبل ہلاک کی تھی۔ اب ہمیں چارے کے لیے کچھ جانور خریدنے تھے اور رستم یہاں کام آیا۔

رستم کے بارے کچھ بتاتا چلوں۔ اس کی عمر بائیس سال ہے اور پارسی ہے جو قدیم دور میں ایران سے آئے تھے۔ اس کا تعلق بہت امیر خاندان سے ہے اور اس کے پاس بمبئی میں کئی لاکھ روپے مالیت کی جائیداد ہے اور اس کی ایک دن کی آمدنی میری سالانہ آمدنی سے زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ رستم کا باپ بہت بڑا تاجر ہے اور اس کی ماہانہ آمدنی جائیداد کی آمدن سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ رستم کے باپ کو شکار کا بہت شوق ہے اور رستم سے بہت محبت کرتا ہے۔ تاہم اسے شکار پر جانے کی اجازت کم ہی ملتی ہے۔ سو جب بھی اسے شکار پر جانا ہو تو میں اپنے والد کو ساتھ لے کر جاتا ہوں اور ایک یا دو گھنٹے کی گپ شپ کے بعد رستم کو اجازت مل جاتی ہے۔

خیر، اصل کہانی کو لوٹتے ہیں۔ رستم نے چار بچھڑے خریدے اور انہیں تیندوے کے آخری شکار والی جگہ کے آس پاس باندھ دیا گیا۔ پہلا بچھڑا ہیل سٹون کی زمین کی حد پر باندھا گیا۔ دوسرا اس سے چوتھائی میل دور ایک چھوٹی سی جھیل کے کنارے اور بانس کے جنگل کے قریب باندھا گیا۔ تیسرا بچھڑا مدیانور گاؤں کے پاس باندھا گیا جبکہ چوتھا بچھڑا مدیانور آنے والی سڑک پر باندھا گیا۔ والد ہمیشہ اپنی مچان ساتھ لاتے ہیں مگر ورگھیس نے اپنے مالک کی مچان ہمارے لیے تیار رکھنے کا وعدہ کیا۔ میں نے طے کیا کہ جب کوئی بچھڑا مارا جائے گا تو پھر مچان باندھیں گے۔

ہم نے زمین میں کھونٹے گاڑ کر بچھڑوں کو پچھلی ٹانگ سے باندھ دیا۔ چارے کے جانور کی گردن میں کبھی رسی نہیں باندھنی چاہیے ورنہ تیندوے اور شیر مشکوک ہو جاتے ہیں۔ چونکہ یہ جانور گلے سے پکڑ کر اپنے شکار کو مارتے ہیں، سو گلے میں لٹکی ہوئی ہر چیز سے وہ گھبراتے ہیں۔

عین وقت پر ہمیں ور گھیس نے بتایا کہ پچھلے دو روز سے بنگلے کے پاس سے شیر بولتا رہا ہے۔ سو میں نے بنگلے کے پاس والے بچھڑے کو رسی کی بجائے زنجیر سے باندھنے کا فیصلہ کیا کیونکہ اگر شیر بچھڑے کو مارتا تو رسی توڑ کر اسے اٹھا لے جاتا۔ چونکہ زنجیر محض ایک ہی تھی، سو باقی تین بچھڑے رسی سے باندھے گئے۔

رستم کھتیوں میں سور مارنے کا سوچ رہا تھا مگر میں نے اسے منع کیا کہ گولی کی آواز سے تیندوا بھاگ جائے گا۔ اگلی صبح چاروں بچھڑے زندہ تھے اور ہم مایوس۔ تاہم میرے والد نے ہمیشہ کہا ہے کہ شکار صبر کا نام ہے۔ سو ایک دو دن اور انتظار کرنا بہتر رہتا۔ تیسری رات بڑے تیندوے نے بنگلے کے پاس والے بچھڑے کو مارا۔ عین اسی رات جھیل کنارے والے بچھڑے کو شیر نے مار دیا۔

میں نے فوراً تیندوے کو بھلا کر شیر مارنے کا سوچا۔ تاہم رستم نے مجھے یاد دلایا کہ یہاں آنے کا مقصد تیندوے کی ہلاکت تھا جس نے ہیل سٹون کے کتے اور گائے کو مارا تھا۔ شیر سے تو ہیل سٹون کو کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔ سو مجھے تیندوے کا شکار کرنا چاہیے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کی بات درست ہے اور والد بھی یہی کچھ کرتے۔ تاہم میں شیر کو مارنے کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہتا تھا۔ میں نے اسے تیندوے کے شکار پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ تاہم رستم نے مجھے چوں چراں کا موقع نہیں دیا اور طے ہوا کہ میں تیندوے کے لیے جبکہ رستم شیر کے لیے بیٹھے گا۔

سڈرک نے میرے ساتھ بیٹھنے کا فیصلہ کیا کہ اس کے خیال میں رستم مچان پر چپ نہیں بیٹھ سکتا۔ سو میں نے ہیل سٹون کا مچان درخت پر بندھوا دیا۔ رستم نے دیہاتیوں سے کہہ کر اپنے لیے مچان بنوالیا۔ میرا مچان بچھڑے کی لاش سے تیس گز جبکہ رستم کا درخت قریب تر تھا۔ میں یہ بتانا بھول گیا کہ چاروں بچھڑے میں نے درختوں کے قریب بندھوائے تھے تاکہ مچان بندھوانے میں مشکل نہ ہو۔

ہم دونوں پارٹیاں چار بجے روانہ ہو گئے کہ رستم کو زیادہ دور جانا تھا۔ رستم اور ور گھیس اپنے ساتھ سینڈوچ، پانی کی بوتل، ٹارچیں، مفلر، کمبل اور پتہ نہیں کیا کیا لے کر تیز قدموں سے روانہ ہوئے۔ سڈرک اور میں آرام سے چہل قدمی کرتے ہوئے روانہ ہوئے۔ موسم گرم تھا، سو ہم نے اپنے ساتھ صرف پانی کی ایک بوتل رکھی۔

مچان پر بیٹھنا بہت بوریت کا کام ہے اور مجھ سے ساکت نہیں بیٹھا جاتا۔ میرے والد ہمیشہ مجھے مچان پر کسی مجسمے کی طرح ساکت بیٹھنے کا حکم دیتے ہیں مگر پتہ نہیں کہ وہ ایسا کیسے کر لیتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ بہت مرتبہ بیٹھا ہوں اور وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے ہیں، پائپ پیتے ہیں اور پھر تھوڑی سی چائے پینے کے بعد پوری رات کسی سنگی مجسمے کی طرح ساکت ہو جاتے ہیں۔ مجھے طرح طرح کی شکایت ہوتی ہیں۔ کبھی پیروں میں سوئیاں چبھنے لگتی ہیں تو کبھی کمر اکڑ جاتی ہے اور درد شروع ہو جاتا ہے۔ مچھر ہمیشہ بہت تنگ کرتے ہیں اور نہ صرف کاٹتے ہیں بلکہ کان اور ناک میں بھی گھسنے لگ جاتے ہیں۔ بچاؤ کا واحد راستہ یہ ہے کہ جونہی مچھر کاٹنے کے لیے جلد پر بیٹھے، اسے چپت مار کر مار دیا جائے۔ والد ہمیشہ اس سے منع کرتے ہیں مگر شاید انہیں معلوم نہیں کہ میرا

خون ان کے خون کی نسبت زیادہ جوان اور لذیذ ہے۔ ویسے بھی بڑوں کو نصیحت کرنے میں پتہ نہیں کیا مزہ آتا ہے۔

خیر، سات بجے اندھیرا ہونا شروع ہو گیا۔ مچھر میرا اور سڈرک کا خون چوس رہے تھے۔ میں نے سڈرک کو مچھر مارنے سے منع کیا تھا۔ سو جب میں نے یہ حرکت کی تو اس نے دو تین بار مجھے کہنی ماری۔ وقت گزرتا گیا اور پونے آٹھ بجے تاریکی میں ایک لمبا سا جسم حرکت کرتا دکھائی دیا۔ پتہ نہیں کہاں سے آیا ہوگا۔ یہ بتاتا چلوں کہ چاندنی نہیں تھی اور ستاروں کی مدھم سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ تاہم اتنی روشنی تھی کہ بڑے درخت دکھائی دے رہے تھے اور یہ بھورا سا جسم بھی دکھائی دے رہا تھا مگر مردہ بھینسا دکھائی نہیں دیا کہ وہ کالے رنگ کا تھا۔ تاہم یہ بھورا جسم اسی سمت جا رہا تھا۔ پھر ہمیں زنجیر ہلنے کی آواز آئی اور پھر ہڈیاں چبانے اور پیٹ بھرنے کی آوازیں آنے لگ گئیں۔ آہستہ سے میں نے رائفل اٹھائی تو نال پر لگی ٹارچ درخت کی ٹہنی سے ٹکرائی اور آواز پیدا ہوئی۔ مردہ بھینسے کی طرف سے غراہٹ کی آواز آئی اور بھورا جسم حرکت کرنے لگا۔ جلد ہی وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ دس منٹ بعد پھر وہی بھورا جسم دائیں جانب سے عین ہمارے نیچے آ گیا۔ پھر ایسی آوازیں آئیں کہ تیندوا پچھلے پیروں پر بیٹھا اپنا جسم چاٹ رہا ہے۔ اس بار میں نے رائفل پھر اٹھائی اور اس کی جانب رخ کر کے ٹارچ جلائی۔ بیس گز دور کتے کی طرح بیٹھا ہوا تیندوا دکھائی دیا۔ تیندوے نے ہماری سمت دیکھا اور عین اسی لمحے میں نے بعجلت نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ میری اعشاریہ ۴۲۳ بور کی ماؤزر گرجی اور تیندوا وہیں گر گیا۔ میرا سمجھا کہ تیندوا مر چکا ہوگا مگر اچانک تیندوے نے جست لگائی اور ہمارے نیچے درخت کے پیچھے گم ہو گیا۔

سڈرک بہت دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ جونہی تیندوا نظروں سے اوجھل ہوا، سڈرک نے اترنے کی ٹھانی۔ میں نے اسے فوراً روک دیا۔ اس نے کہا کہ کچھ نہیں ہوتا، نیچے اترتے ہیں۔ میں نے اسے منع کیا۔

ہم وہاں ایک گھنٹہ بیٹھے۔ مچھروں نے اتنا تنگ کیا کہ ہم نے بنگلے کو جانے کی ٹھان لی۔ سب سے پہلے میں نیچے اترا اور پھر سڈرک نے مجھے رائفل تھمائی۔ پھر وہ پانی کی بوتل اٹھا کر آیا۔ آخری چھ فٹ اس نے اترنے کی بجائے جست لگا کر طے کیے اور دھم سے نیچے گرا۔ عین اسی وقت بہت قریب سے تیندوے کی غراہٹ سنائی دی۔ میں فوراً اس سمت مڑا اور رائفل چھتیائی۔ ٹارچ جل رہی تھی مگر اس سمت کچھ نہ دکھائی دیا۔ چند منٹ رک کر ہم اس سمت بڑھے۔ تاہم امبل کی جھاڑیاں اتنی گھنی اور خاردار تھیں کہ چند قدم سے زیادہ نہ بڑھ سکے۔ سو ہم اس جگہ گئے جہاں تیندوا گولی چلتے وقت بیٹھا تھا۔ ہم نے خون کے نشانات تلاش کیے۔

ٹارچ کی روشنی میں ہمیں خون کا کوئی نشان نہ ملا اور اچانک مجھے خیال آیا کہ میری گولی شاید خطا گئی ہو۔ میں نے سرگوشی میں یہ بات سڈرک سے کہی مگر اس کو پورا یقین تھا کہ گولی تیندوے کو لگی تھی۔ چونکہ مجھے یقین نہیں تھا، سو ہم نے فیصلہ کیا کہ واپس مچان پر بیٹھ جائیں کہ شاید اگر گولی خطا بھی گئی ہو تو تیندوا واپس آئے۔

باقی رات انتہائی بے آرامی سے گزری۔ مچھروں نے جی بھر کر ہمارا خون چوسا۔ صبح کے قریب سردی ہو گئی۔ خیر، بمشکل تمام صبح ہوئی اور ہم نیچے اترے اور گھاس پر لیٹ گئے۔ گھنٹہ بھر بعد جب روشنی ہوئی تو ہم اٹھے۔ سات بجے ہم نے خون کے نشانات کی تلاش شروع کی۔ تھوڑی دور ہی خون کے چند قطرے دکھائی دیے۔ چالیس گز کے فاصلے پر ہمیں بہت مقدار میں خون دکھائی

دیا۔ ظاہر ہے کہ تیندوا شدید زخمی ہوا اور یہاں پہنچ کر کچھ دیر رکا ہوگا۔ شاید یہیں سے اس نے غرا کر ہمیں دھمکایا تھا۔ اب ہمیں اندازہ ہوا کہ ہم کتنے خوش قسمت ہیں کہ تیندوے نے رات ہم پر حملہ نہیں کیا۔

سڈرک نے تیندوے کے خون کی تصویر کھینچی۔ وہ ہر چیز کی تصویر کھینچنے کا شوقین تھا۔ اس جگہ سے خون کی لکیر آگے جا رہی تھی اور سو گز کے فاصلے تک ہمیں ایک اور جگہ تیندوے کے بیٹھنے کے نشانات اور خون بھی ملا۔ ظاہر ہے کہ تیندوا کافی زخمی تھا۔ یہاں سے آگے خون کے نشانات کم ہو گئے کہ شاید چربی یا جھلی کا کوئی ٹکڑا زخم پر آ گیا ہوگا۔

جھاڑ جھنکار کافی گھنا تھا اور ہم نے ہر طرف تلاش کیا۔ تاہم تیندوا نہیں ملا۔ فارسٹ لائن شروع ہو رہی تھی۔ میں اس کے سرے تک گیا اور دیکھنے کی کوشش کی کہ شاید تیندوا دکھائی دے جائے۔

ہم ایک سو گز مزید آگے گئے ہوں گے۔ سڈرک میرے پیچھے بیس گز کے فاصلے پر فارسٹ لائن کے کھلے حصے سے آ رہا تھا۔ اچانک تیندوے نے فارسٹ لائن کی دوسری جانب سے حملہ کیا۔ ظاہر ہے کہ تیندوا مخالف سمت کی جھاڑی میں چھپا ہوا تھا اور میں اسے نہ دیکھ سکا۔ تیندوے نے مجھے گزرنے کا موقع دیا اور پھر حملہ کر دیا۔ سڈرک اس وقت عین اسی مقام پر تھا جہاں تیندوا چھپا ہوا تھا۔ تیندوے نے غراتے ہوئے مجھ پر حملہ کیا۔ غراہٹ کی آواز سن کر میں سمجھا کہ تیندوے نے سڈرک پر حملہ کیا ہوگا مگر جونہی میں رائفل اٹھائے مڑا تو دیکھا کہ تیندوا مجھ پر حملہ آور ہو رہا تھا۔ خوش قسمتی سے میری پہلی گولی سے تیندوے کی اگلی دائیں ٹانگ ٹوٹ چکی تھی اور وہ لنگڑا رہا تھا۔

رائفل کو کندھے پر لگا کر میں نے گولی چلائی جو تیندوے کے گلے میں لگی۔ تیندوا آگے کو جھکا مگر غراتا رہا۔ اتنی دیر میں میں نے دوسری گولی بھی اس کے جسم میں اتار دی۔ تب جا کر مجھے احساس

ہوا کہ تیندوا اور سڈرک ایک ہی سیدھ میں تھے۔ عین ممکن تھا کہ گولی تیندوے کی بجائے سڈرک کو لگتی۔ اب اندازہ کیجیے کہ اس حالت میں بھی سڈرک نے تیندوے کے حملے کا فوٹو کھینچ لیا تھا۔ حالانکہ تیندوے کے حملے کے وقت نہتا بندہ اپنی جان بچانے کو بھاگتا ہے مگر سڈرک نے الٹا کام کیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے فوٹو کھینچنے کا کتنا شوق تھا۔ اس نے بعد میں بتایا کہ اس نے بے سوچے سمجھے کیمرے سے آنکھ لگائی اور بٹن دبا دیا۔

جب ہم بنگلے میں پہنچے تو پتہ چلا کہ رات دو بجے مچھروں سے تنگ آ کر رستم اور ور گھیس واپس آ گئے تھے۔ شیر نمودار نہیں ہوا تھا۔

نو بجے ہم تیندوے کی لاش اٹھا کر بنگلے میں لے آئے اور ایک گھنٹے میں اس کی کھال اتار لی۔ یہ بڑا نر تیندوا تھا جو سات فٹ آٹھ انچ لمبا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد رستم نے کہا کہ اس کی مچان کو جا کر دیکھتے ہیں۔ اس دوران ور گھیس نے تیسرے اور چوتھے بچھڑے کی دیکھ بھال کے لیے بندے بھیج دیے تھے تاہم وہ صحیح سلامت تھے۔

جب ہم رستم کی مچان کو پہنچے تو دیکھا کہ شیر آ کر اپنا پیٹ بھر گیا تھا۔ شاید شیر نے ان لوگوں کو مچان پر بیٹھتے دیکھ لیا تھا اور ان کے جانے کے بعد آ کر اپنا پیٹ بھر گیا تھا۔ اس نے تین چوتھائی لاش ہڑپ کر لی تھی۔

رستم کو بہت مایوسی ہوئی اور اس نے دوبارہ بیٹھنے کا فیصلہ کیا۔ اس سے مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے ور گھیس کو ایک اور بندے کے ساتھ چوتھا بچھڑا یہاں لانے کا کہا۔ یہ بچھڑا مدیا نور کے پاس ہی بندھا تھا اور دو گھنٹے میں پہنچ گیا۔ اسے ہم نے بچھڑے کی لاش سے تیس گز کے فاصلے پر باندھ دیا۔ میرا خیال تھا کہ اس طرح اگر شیر لاش پر نہ بھی لوٹا تو بھی نئے بچھڑے کو مارنے ضرور آئے گا۔

لاش دو روز پرانی تھی اور بہت بدبو دے رہی تھی۔ رستم اس کے خلاف تھا کہ شیر جب آتا تو بچھڑے کی لاش کے جگہ زندہ بچھڑا پا کر فرار ہو جاتا۔ تاہم میرا خیال تھا کہ یہ اچھا منصوبہ ہے۔

ساڑھے پانچ بجے رستم، سڈرک اور میں مچان پر پہنچ گئے اور تازہ پتوں کی آڑ بنالی کہ کل رات والے پتے مرجھا چکے تھے۔ رستم پہلے گولی چلاتا اور پھر میں۔ سڈرک نے اپنے کیمرے پر بلب اور منعکس گر بھی لگا لیا تھا۔

دھند لکا چھاتے ہی ہر قسم کے حشرات نے ہمارا جینا دوبھر کر دیا۔ خیر، ہم نوجوان تھے اور شوق انتہا پر تھا۔ رستم شیر کے شکار کا بہت عرصے سے منتظر تھا۔

آٹھ بج گئے، پھر نو بجے اور پھر دس۔ پھر ہمیں تالاب کی دوسری جانب پہاڑ سے اترنے والے شیر کی آواز سنائی دی۔ پینتالیس منٹ بعد ہمیں کاکڑ کی آواز اپنے بائیں جانب سے سنائی دی۔ یہ بات تو واضح ہو گئی تھی شیر آ رہا ہے۔ ہمارا جوش بڑھ گیا۔ ہم انتظار کرتے رہے۔ یہاں میری پچھلی مچان سے زیادہ تاریکی تھی کہ یہاں بانس کا گھنا جنگل تھا۔ میں نے رستم کو سرگوشی میں کہا کہ جب تک شیر بچھڑے کو مارے نہ یا لاش پر پیٹ نہ بھرنے لگے، گولی نہ چلائے اور میں اس پر ٹارچ بھی ڈالوں گا۔ خوش قسمتی سے نیا بچھڑا سفید رنگ کا تھا، سو ہمیں کچھ کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ ٹانگ سے بندھی رسی سے وہ بار بار اپنی ٹانگ چھڑانے کی کوشش کرتا اور کوئی نہ کوئی آواز کرتا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ بچھڑے کو خطرے کا احساس ہو رہا ہے۔

دس منٹ تک خاموشی رہی۔ پھر شیر کی دھاڑ سنائی دی اور اس نے بچھڑے پر جست لگائی۔ رستم جوش سے کپکپا رہا تھا۔ میں نے اس کے شانے کو مضبوطی سے پکڑا۔ بچھڑے کا دم گھٹنے کی آواز اور پھر اس کی گردن کا منکا ٹوٹنے کی آواز بھی سنائی دی اور پھر بچھڑا دھم سے زمین پر گرا۔

میں نے رستم کے شانے کو پکڑے رکھا۔ دس منٹ خاموشی رہی۔ پھر شیر نے بچھڑے کی دم کتری۔ ہم منتظر رہے۔ عین اسی وقت شیر نے بچھڑے کا پیٹ پھاڑ کر آنتیں نکالیں۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اب شیر کی پوری توجہ لاش پر مرکوز ہو گی۔ سو میں نے رستم کا شانہ چھوڑا اور اسے ٹھوکہ دیا کہ گولی چلائے۔

ہم دونوں نے بیک وقت رائفلیں اٹھائیں اور دس سیکنڈ کے بعد میں نے اپنی ٹارچ کا بٹن دبایا۔ تیز روشنی کی شعاع سیدھی شیر پر پڑی جو لاش کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ اس نے مڑ کر ہماری جانب دیکھا۔ عین اسی وقت رستم نے بھی اپنی ٹارچ روشن کی۔ سیکنڈ گزرتے گئے مگر رستم نے گولی نہیں چلائی۔ میں اپنی رائفل چلانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ رستم کی دونالی ۴۰۰/۴۵۰ کا دھماکہ سنائی دیا۔ رستم نے دونوں نالیں ایک ساتھ چلادی تھیں اور اس کا دھکا بھی شدید تھا۔ رستم پیچھے کو جھکا مگر اس کی دونوں گولیاں شیر کے شانے سے ذرا اوپر گردن پر لگیں۔ شیر تڑپا اور اس طرح آگے کو جھکتا گیا جیسے سونے لگا ہو۔ اس کی دم چند بار ہلی اور پھر ساکت ہو گیا۔ رستم نے اپنا پہلا شیر مار لیا تھا۔

ہم نے مزید نصف گھنٹہ انتظار کیا مگر شیر مر چکا تھا۔ پھر ہم نیچے اترے مگر ہماری ٹارچوں کا رخ شیر کی جانب ہی تھا۔ شیر کی لمبائی ناک سے دم کے سرے تک نو فٹ چار انچ تھی۔

پھر ہم خوشی خوشی بنگلور لوٹے۔ رستم نے پہلا شیر مار لیا تھا۔ میں نے مسٹر ہیل سٹون کے مویشی کھانے والے تیندوے کو ہلاک کر لیا تھا۔ لیکن ہم دونوں سے زیادہ سڈرک خوش تھا کہ وہ نہ صرف وہ تیندوے کے حملے سے بچا بلکہ یہ بھی کہ اس نے تیندوے کے حملے کی تصویر بھی کھینچ لی تھی۔ تیندوے کے حملے کا نتیجہ تکلیف دہ موت نہ بھی ہوتا تو بھی شدید زخمی تو ہو سکتا تھا۔

جب میں لے والد کو یہ ساری کہانی سنائی تو انہوں نے رستم کو اور مجھے مبارکباد دی۔ تاہم انہیں سڈرک کے واقعے کا علم نہیں ہوا تھا کہ وہ کیسے تیندوے اور میری گولی سے بچا تھا۔

اگلے دن جب والد نے سڈرک کی کھینچی ہوئی تصویر دیکھی تو آگ بگولہ ہو گئے۔ اُس وقت تو مجھے ان کی صلواتیں سن کر بہت برا لگا مگر اب سوچتا ہوں تو سمجھ آتی ہے کہ ان کا غصہ بجا تھا۔

میں نے دو بڑی غلطیاں کی تھیں۔ پہلی تو یہ کہ میں نے جھاڑیوں کو بغور نہیں دیکھا تھا جس کی وجہ سے تیندوا مجھے دکھائی نہ دیا۔ دوسری یہ کہ جب میں نے تیندوے پر گولی چلائی تو محض بیس گز دور تیندوے کے عین پیچھے سڈرک کھڑا تھا۔ خیر، قسمت ہمیشہ مبتدیوں کی مدد کرتی ہے، سو میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔

۸۔ راج نگر کا عجیب شیر

اس کہانی کی تحریر کے وقت تک (نومبر ۱۹۵۵) یہ شیر زندہ ہے اور اس کے شکار کی ہر کوشش میں مجھے ناکامی ہوئی ہے۔ دو سال سے زیادہ کے عرصے میں میرے علاوہ بھی اور کئی شکاریوں کو اس شیر کے پیچھے ناکامی ہوئی ہے۔

یہ شیر غیر معمولی تھا۔ اس کی عادات عام شیروں سے بہت مختلف تھیں اور اس کے مٹر گشت ان علاقوں میں ہوتی تھی جہاں کوئی شیر نہیں جاتا۔ اس کے علاوہ یہ انسانوں کو مارنے کی بجائے محض اپنے اگلے پنجوں سے زخمی کرتا تھا۔ اس طرح کے واقعات میں اس شیر نے ۴۳ انسانوں کو زخمی کیا جن کی اکثریت چرواہوں کی تھی۔ تاہم اس نے ایک بار بھی کسی انسان کو نہیں کاٹا اور نہ ہی ہلاک کیا۔ ہر بار وہ اپنے شکار کے سر کو بری طرح زخمی کرتا اور چہرے اور گردن کے علاوہ سینے اور گردن کو بھی زخمی کرتا تھا۔

اس رویے سے مجھے شک ہوا کہ یہ شاید شیر نہیں بلکہ تیندوا ہوگا۔ تاہم بعد میں جب میں نے مضروبین سے بات کی تو ہر بندے نے یہی بتایا کہ اسے تیندوے نے نہیں بلکہ شیر نے زخمی کیا تھا۔ مجھے ایک شک یہ بھی ہوا کہ شاید یہ شیر کسی نے زخمی کیا ہو یا ویسے زخمی ہوا ہو جس کی وجہ سے وہ اپنے شکار کو کاٹ نہ سکتا ہو۔ تاہم چرواہوں نے اسے بھی رد کیا اور بتایا کہ دو سال کے دوران اس نے کم از کم ۲۰۰ مویشی مار کر کھائے ہیں۔ ہر بار انھوں نے شیر کے شکار کردہ جانور کی لاش دیکھی ہے مگر انہیں کوئی بھی شہادت ایسی نہیں ملی کہ شیر کو کھانے میں کوئی مسئلہ ہوا ہو۔ اس نے نہ صرف عام شیروں کی طرح اپنے شکار کی گردن توڑ کر اسے ہلاک کیا تھا بلکہ اسے عام شیروں کے ہی انداز میں کھایا تھا۔

اس جانور کے بارے ایک اور عجیب بات یہ تھی کہ اس نے اپنے شکار کی ابتدائی ایسے علاقے سے کی تھی جہاں شیر کبھی نہیں جاتے، یعنی نیچی خار دار جھاڑیاں، پتھریلی پہاڑیاں اور ندی نالے جن میں پتھر بکثرت تھے اور کناروں پر بانس کے گھنے جنگل تھے۔ ایسے علاقے میں تیندوے تو عام ملتے ہیں مگر شیر کبھی ایسی جگہ دکھائی نہیں دیے۔

جنگل کا یہ حصہ ڈم بیم کے جنوب میں واقع ہے اور یہ علاقہ ضلع شمالی کومبتور کا حصہ ہے۔ یہاں سے ڈم بیم اچانک ۲۵۰۰ فٹ نیچے اترتا ہے اور پھر خشک اور جھاڑیوں والا علاقہ شروع ہوتا ہے اور یہاں کھجور کے درخت بھی ملتے ہیں۔ جنگلی بھیڑ بھی اکا دکا پائی جاتی ہیں اور کچھ جنگلی مور بھی۔ اس کے علاوہ امبل کی جھاڑیاں بکثرت ہیں۔ یہاں جنگلی جانور کم ہی پائے جاتے ہیں۔ یہ علاقہ شمال سے جنوب تک پانچ میل جبکہ مشرق سے مغرب تک تیس میل چوڑا تھا۔ اس جگہ بھوانی دریا گزرتا تھا اور آگے جا کر یہ دریائے کاویری کا حصہ بن جاتا ہے۔

ہمیں یہ بتایا گیا کہ یہ شیر نیلگری کے پہاڑوں سے آیا تھا اور دریائے مویار سے ہوتا ہوا اس علاقے تک آن پہنچا اور یہیں رک گیا۔ اس علاقے کو پسند کرنے کی وجہ صاف ظاہر تھی کہ یہاں دور دور تک مویشی پالنے والے آباد تھے اور جنگلی جانوروں کی کمیابی کو مویشیوں نے پورا کر دیا تھا۔ ویسے بھی جنگلی جانور کی نسبت مویشیوں کا شکار کہیں آسان ہوتا ہے۔

کہانی کچھ اس طرح آگے بڑھتی ہے کہ شیر عام انداز سے مویشی مارتا رہا اور جونہی اسے بھگانے کی کوشش کی جاتی تو وہ اپنا شکار چھوڑ کر دیگر شیروں کی مانند بھاگ جاتا۔ تاہم چرواہوں کی بار بار کی مداخلت سے شیر تنگ آ گیا۔

ایک بار جب شیر فربہ گائے کو ہلاک کر کے گھسیٹ رہا تھا تو چرواہے نے اسے پتھر مارے جو اس کے پہلو پر لگے۔ اگلے لمحے شیر نے گائے کو چھوڑ کر چرواہے پر حملہ کر دیا اور اس کے سینے اور چہرے پر پنجے مارے۔ پھر واپس جا کر گائے کو گھسیٹ لے گیا اور اس سے پیٹ بھرا۔

اس کے بعد بھی کئی بار چرواہوں نے شیر کو اس کے شکار سے ہٹانے کی کوششیں کیں مگر ہر مرتبہ شیر نے حملہ کر کے انہیں زخمی کر دیا۔

فطری بات ہے کہ ایسے حملے بڑھتے گئے اور چرواہے شیر کو حملے کرتے وقت، شکار شدہ جانور کو گھسیٹتے وقت یا پیٹ بھرتے وقت تنگ کرنے سے کترانے لگے۔

اس طرح وقت گزرتا گیا اور دو سال بیت گئے۔ اس شیر کے ہاتھوں مجروح ہونے والوں کی تعداد ۳۳ ہو گئی۔ ان میں سے گیارہ افراد زخم خراب ہونے کی وجہ سے مر گئے۔ تاہم ان اموات کو براہ راست شیر سے منسوب کرنا ممکن نہیں۔ یہ اموات شیر کے حملے کا بالواسطہ نتیجہ تھیں

پھر جولائی ۱۹۵۵ میں ایک انسان واپس نہ لوٹا۔ سب جانتے تھے کہ اس پر شیر نے حملہ کیا تھا کہ اس نے مدد کے لیے کافی چیخ و پکار کی تھی مگر دوسرا چرواہا اس کی مدد کی بجائے بھاگ کھڑا ہوا۔ پہلے ہمیشہ ایسے حملوں میں زخمی کچھ دیر بعد چل کر یا گھسٹ کر سڑک یا بڑی پگڈنڈیوں تک پہنچ جاتے تھے۔ تاہم یہ بندہ واپس نہ پہنچا۔ دو گھنٹے بعد کافی لوگ جمع ہو کر اس کی تلاش میں نکلے۔ جہاں حملہ ہوا تھا، وہاں یہ سب پہنچے تو گائے کی لاش ملی مگر چرواہا گم تھا۔ ان بندوں کی ہمت جواب دے گئی اور پیش قدمی کی بجائے یہ لوگ گاؤں واپس لوٹ آئے۔ مجروح پھر کبھی نہ دکھائی دیا۔

چھ مزید ایسے واقعات ہوئے جن میں سے تین بندے تو واپس لوٹ آئے جو بری طرح نُچے ہوئے تھے مگر باقی تین نہ لوٹے اور نہ ہی پھر کبھی دکھائی دیے۔ جہاں سے میری کہانی شروع

ہوتی ہے، اس وقت تک ۴ افراد ہلاک اور ۳۶ زخمی ہو چکے تھے۔ تاہم ہر مرتبہ زخمی ہونے والے بندے کو محض پنجوں سے ہی زخم پہنچے تھے۔ اب یہ کہنا ممکن نہیں کہ چار اموات جو شمار ہوئی ہیں، آیا شیر انہیں کھا گیا تھا یا پھر یہ کہ شیر نے انہیں جنگل میں کسی ایسی جگہ جا چھوڑا جہاں ان کی لاشیں گیدڑ، لگڑ بگڑ اور گِدھ کھا گئے ہوں گے۔

میں اس شیر کی وارداتوں کے بارے وقتاً فوقتاً اخبارات میں پڑھتا رہتا تھا مگر پہلی بار جب سرکاری طور پر مجھ سے رابطہ کیا گیا تو تفصیلات بھی موصول ہوئیں۔ عین اسی وقت میرے پاس کچھ چھٹی باقی تھی، سو میں نے یہ چھٹی شیر کے پیچھے صرف کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

جنگل کے نقشے اور وارداتوں کی تفصیل سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ راج نگر کو اپنا مرکز بنانا بہتر رہے گا۔ یہاں محکمہ جنگلات کی ایک عمارت بھی تھی جہاں میں قیام رہتا۔ ڈیم بیم کے راستے یہ مقام بنگلور سے ۱۴۷ میل دور تھا اور راستہ اتنا اچھا تھا کہ سٹڈ بیکر سے میں چار گھنٹوں میں شام کو چار بجے وہاں پہنچ گیا۔

سفر کے دوران مجھے اندازہ نہیں ہوا کہ آگے کتنا دلچسپ وقت آئے گا۔ راج نگر سے دو میل قبل میں نے سڑک کنارے دو افراد کے سہارے تیسرے بندے کو چلتے دیکھا۔ جب میں ان کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ تیسرا بندہ لہولہان تھا۔ سو میں نے ان سے پوچھا تو پتہ چلا کہ یہ بندہ شیر کے پنجوں سے زخمی ہوا ہے۔ مزید سوال کیے تو جواب ملا کہ شیر نے چھپ کر اس کے قریب پہنچ کر اسے زخمی کیا تھا۔ اس بندے نے بتایا کہ شیر کے بارے اسے تب پتہ چلا جب شیر ہلکا سا غرایا اور اس کے سامنے نمودار ہوا۔ پھر پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہو کر شیر نے اس کے سر اور سینے پر بری طرح پنجے مارے۔ جب شیر کے وزن سے یہ بندہ نیچے گرا تو اس نے مدد کے لیے چیخ پکار شروع کر دی۔ پھر

شیر نے اسے چھوڑ کر مویشیوں کا رخ کیا کہ مویشی اس بندے کے آس پاس بھاگ رہے تھے۔ یہ بندہ ابھی زمین پر ہی پڑا تھا کہ شیر نے ایک نوعمر بھورے بیل کو مارا اور گھسیٹ کر لے گیا۔ یہ بندہ کھڑا ہوا اور بھاگ کر سڑک تک پہنچا۔ اس کی چیخ پکار سن کر دو اور بندے کچھ دیر بعد وہاں پہنچ گئے۔

میں نے اس موقعے کو خدائی دین سمجھا اور فوراً اس مقام کا اتہ پتہ معلوم کیا۔ پھر ایک بندے سے کہا کہ وہ میرے ساتھ چلے جبکہ دوسرا بندہ اس زخمی کو لے کر راج نگر جائے۔

یہ سن کر دونوں بندے آپس میں لڑنے لگے کہ دونوں کا ہی کہنا تھا کہ انہیں گاؤں میں انتہائی ضروری کام ہیں۔ ظاہری بات تھی کہ انہیں شیر کے پیچھے جانے سے ڈر لگ رہا تھا۔ یہ شیر اتنی دہشت پیدا کر چکا تھا کہ ان بندوں کا رویہ فطری تھا۔ ویسے بھی میں ان کے لیے یکسر اجنبی تھا اور وہ کیسے مجھ پر اعتبار کرتے کہ میں شیر کے حملے کے وقت انہیں چھوڑ کر نہیں بھاگوں گا۔

کافی خوشامد، منت اور دھمکیوں کے بعد ایک بندہ میرے ساتھ جانے کو تیار ہو گیا جبکہ دوسرے نے فوراً مجروح کے ساتھ راج نگر کا سفر شروع کیا۔

میں اور یہ بندہ سڑک سے نیچے اتر کر جنگل میں داخل ہوئے۔ سارے راستے پر خون کے نشانات تھے۔ ایک جگہ پتھروں پر خون کے اتنے نشانات تھے کہ مجھے علم ہو گیا کہ زخمی بندہ میرے اندازے سے کہیں زیادہ زخمی تھا۔ مجھے خیال آیا کہ مجھے اس بندے کو کار میں ستیا منگلم کے ہسپتال لے جانا چاہیے تھا۔ تاہم میں نے اس بات پر توجہ نہیں دی کہ اس شیر سے مڈ بھیڑ کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔

کچھ دیر بعد ہم جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔ یہاں ریت پر لکھی داستان صاف دکھائی دی۔ پھر ہم نے گھوم پھر کر تیس گز دور وہ جگہ دیکھی جہاں بیل مارا گیا تھا۔ میرے ہمراہی نے مزید آگے جانے سے انکار کر دیا۔ اتنا خوفزدہ بندہ ساتھ لے جایا جائے تو وہ مدد کی بجائے مشکل پیدا کرتا ہے۔ اسے وہیں چھوڑ کر میں نے گھسیٹنے کے نشانات کا پیچھا شروع کر دیا۔ وہ بندہ وہیں پریشان کھڑا رہا۔ گھسیٹے کے نشانات کا رخ نیچے ایک کھائی کی طرف تھا جو اس مقام اور چوتھائی میل دور ایک اور پہاڑی کے درمیان واقع تھی۔

بد قسمتی سے مجھے اتنی جلدی شیر کی تلاش میں نکلنے کا اندازہ نہیں تھا، سو میں نے ربر سول والے جوتوں کی بجائے عام جوتے پہنے ہوئے تھے۔ یہ جوتے چلتے ہوئے آواز پیدا کرتے ہیں۔ یہاں جگہ جگہ پتھر تھے جس کی وجہ سے چلتے ہوئے کچھ نہ کچھ آواز پیدا ہو رہی تھی۔ میں جب نالے کے کنارے پہنچا تو وہاں جھاڑ جھنکار بہت گھنا ہو چکا تھا۔ وہاں رک کر میں نے جائزہ لیا۔ نالہ چکر کاٹتا جا رہا تھا اور سامنے والی پہاڑی نسبتاً صاف تھی۔ میں نے بغور جائزہ لیا کہ شاید شیر یا بیل کی لاش دکھائی دے جائے مگر ناکام رہا۔ میرا اندازہ تھا کہ شیر نے بیل کی لاش کو نالے میں ہی کہیں چھپایا ہوگا اور وہیں پیٹ بھر رہا ہوگا۔ اگر وہ پیٹ نہ بھی بھر رہا ہو تو بھی آس پاس ہی موجود ہوگا۔

میرے جوتے نقصان دہ تھے کہ میری آمد کا اعلان کر رہے تھے۔ اگر میں جوتے اتار کر چلتا تو لازمی بات تھی کہ کانٹے چبھ جاتے۔ تیز دھار پتھر بھی جا بجا تھے۔ تاہم اس موقعے کو ہاتھ سے جانے دینا بھی غلط ہوتا۔ شاید مجھے دوبارہ ایسا موقع کبھی نہ ملتا۔ پانچ بج رہے تھے اور سورج غروب ہونے میں ابھی ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔

ابھی میں کھڑا یہ سوچ ہی رہا تھا کہ شیر نے پہل کر دی۔ اس نے شاید میرے قدموں کی آہٹ سن لی تھی اور شاید مجھے مجھ دیکھ بھی لیا تھا۔ خیر، اس نے پہلو سے حملے کا سوچا۔ میری لاعلمی میں وہ میرے قریب اس ڈھلوان تک پہنچ گیا جہاں میں کھڑا تھا۔ تاہم وہ مجھ سے ذرا پیچھے اور اوپر کی جانب تھا۔ پیٹ کے بل رینگتے ہوئے وہ مجھ سے دس فٹ پیچھے ایک جھاڑی تک پہنچ گیا اور میں اس کی موجودگی سے لاعلم تھا۔ اس بار میری چھٹی حس نے بھی مجھے خبردار نہیں کیا۔ میں نے آگے بڑھنے کو قدم اٹھایا ہی تھا کہ عین پیچھے سے سماعت شکن دھاڑ سنائی دی اور شیر نے حملہ کر دیا۔ میں نے مڑتے ہوئے گولی چلادی جو خطا گئی۔

شاید رائفل کے دھماکے یا پھر میرے رویے سے وہ ڈر گیا اور اس نے فرار کو ترجیح دی۔ نالے کے اندر سے دور تک اس کے غرانے کی آوازیں آتی رہیں۔ ہر ممکن تیزی سے میں نالے میں اترا اور بیل کی لاش عین سامنے پڑی تھی۔ شیر میری آمد سے قبل پیٹ بھرنا شروع کر چکا تھا کہ میری آمد کو بھانپ کر اس نے حملے کا سوچا۔

اس جگہ درخت نہیں تھے، سو میں ایک گھنی جھاڑی کے نیچے بیٹھ گیا مبادا کہ شیر واپس لوٹے۔ سوا چھ بجے میں نے احتیاط سے واپسی کا رخ کیا۔ جہاں اپنے ہمراہی کو چھوڑ کر آیا تھا، وہ وہاں نہیں ملا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ گاؤں کو بھاگ گیا ہوگا۔ سو میں نے سڑک کا رخ کیا اور کار میں بیٹھ کر راج نگر پہنچ گیا۔

راج نگر میں بڑا مجمع اکٹھا ہو گیا تھا اور فارسٹ گارڈ بھی آ گیا تھا۔ پتہ چلا کہ زخمی بندہ اپنے بھائی اور بیوی کے ساتھ ستیا منگلم کے ہسپتال کو جا چکا ہے۔ اس کو راج نگر لانے والا دوسرا بندہ تو موجود تھا مگر میرا ہمراہی دکھائی نہ دیا۔

مجھے علم تھا کہ وہ بندہ نہ تو اس جگہ رکتا جہاں میں نے اسے چھوڑا تھا اور نہ ہی وہ سڑک پر ٹھہرتا۔ پھر وہ کہاں گیا ہوگا؟ ہمیں علم تھا کہ شیر کی موجودگی کی وجہ سے وہ جنگل میں کبھی نہ رکتا۔ میرے سوالات کو سن کر اس بندے کی بیوی اور خاندان کے دیگر افراد رونے پیٹنے لگے۔

اب تاریکی گہری ہو چکی تھی اور اس بندے کی تلاش کا کام ممکن نہ تھا۔ خیر، میں نے فارسٹ گارڈ کو ساتھ لیا اور واپس اس جگہ کا رخ کیا جہاں میں کار سے اتر کر شیر کی تلاش میں گیا تھا۔ یہاں رک کر میں نے فارسٹ گارڈ سے کہا کہ وہ اس بندے کو آوازیں دے۔ کوئی جواب نہ ملا۔ پھر ایک میل آگے گئے اور واپس گاؤں کو لوٹے۔ اب یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ اس بندے کو شیر اٹھا کر لے گیا تھا۔ جو ایک گھنٹہ میں نے نالے میں بیٹھ کر شیر کا انتظار کیا تھا، اس دورانیے میں شیر اس بندے کو اٹھا کر لے گیا ہوگا۔

اس رات ہمیں نیند نہ آئی کہ اس بندے کے لواحقین میرے کمرے کے سامنے بیٹھ کر بین کرتے رہے۔ وہ مجھے اس بندے کی ہلاکت کا ذمہ دار سمجھ رہے تھے۔ اگر میں اس بدقسمت بندے کو ساتھ جانے پر مجبور نہ کرتا تو وہ اب بھی زندہ ہوتا۔

علی الصبح میں اس جگہ واپس لوٹا جہاں اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر میں نے شیر کے پنجوں یا دیگر علامات کی تلاش شروع کر دی۔ زمین سخت تھی اور کوئی نشان نہ ملا۔ پھر میں نے دائروں کی شکل میں تلاش شروع کر دی اور دائرے بڑھاتا گیا۔ تاہم ناکامی ہوئی۔ پھر میں نے سوچا کہ شاید اس بندے نے تنہائی سے گھبرا کر سڑک کا رخ کیا ہوگا۔ سو میں نے سڑک کی جانب نشانات کی تلاش شروع کر دی۔

جس مقام پر میں نے اسے چھوڑا تھا، اس سے ۳۰۰ گز کے فاصلے پر مجھے ایک چپل ملا۔ دوسرا چپل بھی قریب ہی پڑا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ بندہ بھاگتے ہوئے چپلیں اتار کر پھینک گیا ہوگا۔ تاہم خشک گھاس کی وجہ سے کوئی نشان نہ ملا۔ پھر تلاش کے دوران تھوڑی دور سفید رنگ کا کپڑا پھڑپھڑاتا دکھائی دیا جو اس بندے کی دھوتی تھی۔

گھاس اور جھاڑیوں پر خون کے دھبے دکھائی دیے اور قریب سے دیکھا تو پتہ چلا کہ اس جگہ دوڑتے ہوئے شیر نے اپنے شکار کو پکڑا تھا۔ پھر متوفی کو گھسیٹ کر وہ سڑک کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا نالے میں لے کر جہاں داخل ہوا، وہ بیل کی لاش سے کافی نیچے تھا۔

نشانات پر چلتے ہوئے چوتھائی میل چل کر میں نالے میں اترا۔ یہاں بالکل سکوت تھا۔ شیر نے لاش کو وہیں کہیں چھپایا ہوگا۔

خاموشی سے دیکھتے ہوئے میں نے سو گز دور ایک مقام پر دو کوے دیکھے جو ببول کے درخت پر اونچے بیٹھے کائیں کائیں کر رہے تھے۔ ان کا رخ نیچے کی طرف تھا۔ شاید وہ لاش کو یا پھر شیر کو دیکھ رہے ہوں گے۔ شاید شیر اس وقت مجھے دیکھ رہا ہوگا۔ جنگل میں دیگر جانوروں اور پرندوں کے مشاہدے سے اہم معلومات مل سکتی ہیں۔

نالے کے عین وسط میں چلتے ہوئے میں آگے بڑھا۔ ربر سول والے جوتوں سے پیش قدمی میں کوئی آواز نہیں ہو رہی تھی۔ ابھی میں ببول کے درخت سے پچاس گز دور ہی تھا کہ کوؤں نے مجھے دیکھ لیا اور اڑ گئے۔

میں لے اس درخت کو ذہن میں بٹھا لیا اور پیش قدمی جاری رکھی۔ ببول کے عین نیچے نالے کے کنارے سے ایک کالے رنگ کی چٹان ابھری ہوئی تھی۔ عین اس چٹان کے نیچے بندے کی ادھ

کھائی لاش پڑی تھی۔ متوفی کا نام منیا پا تھا۔ نرم ریت پر شیر کے پگ صاف دکھائی دیے اور ان کے معائنے سے علم ہوا کہ شیر نر ہے اور عام جسامت کا حامل بھی۔

اس ببول کے سوا یہاں اور کوئی درخت نہیں تھا جہاں بیٹھ سکتا۔ ببول کا درخت بہت خار دار ہوتا ہے جس پر بیٹھنا ممکن نہیں۔ اس کے علاوہ بانس کا جھنڈ یا گھنی جھاڑیاں بھی نہیں تھیں جہاں چھپ کر بیٹھ سکتا۔ چونکہ میں اس بندے کی موت کی وجہ خود کو سمجھ رہا تھا، سو مجھے اس شیر کے خلاف کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔

مجھے علم تھا کہ شیر سہ پہر سے قبل نہ لوٹتا۔ تاہم لاش جہاں پڑی تھی، گدھ اسے کچھ دیر میں دیکھ لیتے اور پھر اس کو چٹ کر جاتے۔ سو میں نے اپنا خاکی کوٹ اتارا اور لاش پر ڈال کر اسے پتھروں سے دبا دیا۔ پھر میں نے کار میں بیٹھ کر راج نگر کا رخ کیا۔

راج نگر پہنچ کر میں نے یہ بری خبر سنائی تو متوفی کے خاندان والوں کے بین میں شدت پیدا ہو گئی۔ متوفی کی بیوہ نے لاش کا کریا کرم کرنے کے لیے اس کی فوری واپسی کا مطالبہ کیا۔ تاہم اسے یہ سمجھانے میں پورا گھنٹہ لگ گیا کہ اس طرح شیر کو ٹھکانے لگانے کا سنہری موقع ہاتھ سے نکل جائے گا۔ آخر اس نے بہت مشکل سے اجازت دے دی۔

ناشتے کے بعد میں نے پٹیل اور فارسٹ گارڈ کے ساتھ مشورہ کیا۔ میں نے انہیں وہ مقام بتایا جہاں لاش موجود تھی۔ ان کا خیال تھا کہ وہاں بیٹھنا انتہائی احمقانہ قدم ہوتا۔ مجھے ان کی بات سے اتفاق تھا مگر اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ تاہم اگر ہم لاش کو گاؤں واپس لاتے تو بھی اس سے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔

دوپہر کے وقت میں لاش سے چند گز کے فاصلے پر بیٹھ گیا۔ لاش سے بو اٹھنے لگ گئ تھی۔ ہزاروں مکھیاں اس میرے کوٹ پر جمع تھیں اور جونہی میں نے کوٹ اٹھایا تو وہ لاش سے چمٹ گئیں۔

میں لے نتھنوں میں روئی ٹھونس لی تھی مگر پھر بھی بو پریشان کر رہی تھی۔ گرمی بہت شدید تھی۔ اکا دکا جھینگر کے علاوہ کوئی آواز نہ سنائی دے رہی تھی۔

تین بج گئے اور پھر چار اور پھر پانچ۔ ساڑھے پانچ بجے ایک مور پر پھڑ پھڑاتا نالے میں اترا۔ میں بے حس و حرکت بیٹھا تھا سو مور کو میری موجودگی کا علم نہ ہو سکا۔ اس سے جنگل میں بے حس و حرکت بیٹھنے کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے۔ مجھ سے دس فٹ دور پہنچ کر اچانک اسے لاش اور میری موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے بعجلت اڑان بھری اور نالے سے نکل گیا۔

آپ کو اندازہ ہو گا کہ لاش کی بو سے میں پریشان تھا اور ہیجان اور خوف کی کیفیت بھی طاری تھی۔ اگلے پندرہ منٹ یکسر خاموشی میں گزرے۔ ایسی خاموشی جو ہر چیز پر چھا چکی تھی۔ جھینگر اور پرندے بھی خاموش تھے۔ یہ خاموشی محض اس وقت طاری ہوتی ہے جب آپ آدم خور کے انتظار میں بیٹھے ہوں اور وہ آنے والا ہو۔

میں بے حس و حرکت بیٹھا تھا مگر میری آنکھیں سامنے موجود جھاڑ جھنکار اور اطراف کا بغور جائزہ لے رہی تھیں۔ میری تمام حسیں پوری طرح بیدار تھیں مگر نہ تو کچھ دکھائی دیا اور نہ ہی کچھ سنائی دیا۔

جنگی مرغ کی آواز نے ماحول پر چھایا ہوا طلسم توڑ دیا۔ سوا چھ بج گئے۔ پھر ایک شب بیدار پرندے کی آواز آئی۔ مجھے علم ہو گیا کہ روانگی کا وقت آن پہنچا۔ تھوڑی دیر میں تاریکی چھا جاتی اور پھر زمین پر بیٹھ کر آدم خور کا انتظار خودکشی ثابت ہوتا۔

اس جگہ سے اٹھ کر میں نے کار کا رخ کیا جہاں پہلے سے کئی بندے لاش کو اٹھانے کی خاطر جمع تھے۔ جب میں کار کو پہنچا تو تاریکی چھا چکی تھی۔ مجھے علم تھا کہ ٹارچ کی روشنی اور ہماری تعداد آدم خور سے ہمیں بچائے گی۔ نالے میں پہنچ کر ہم نے لاش اٹھائی اور پرانے کمبل میں لپیٹ لی۔ یہ بندے لاش کو لے کر راج نگر روانہ ہوئے اور میں نے بذریعہ کار واپسی کا رخ کیا۔

اگلی صبح میں نالے میں اترا اور دیکھا کہ شیر واپس نہ لوٹا تھا۔ میں نے نالے میں ہی چلتے ہوئے دو دن پرانی بیل کی لاش کا رخ کیا۔ میری پیش قدمی بہت آہستہ تھی کہ بعض جگہ نالہ محض چھ فٹ چوڑا تھا۔ بیل کی لاش متوفی کی لاش والے مقام سے نصف میل دور تھی اور ایک جھاڑی کے نیچے چھپی ہوئی تھی۔ اس جگہ گدھ لاش کو نہ دیکھ سکتے تھے۔ تاہم جب میں وہاں پہنچا تو پتہ چلا کہ شیر پچھلی رات وہاں آیا تھا اور لاش کو پوری طرح کھا گیا تھا۔ شاید اسے انسانی لاش سے دلچسپی نہ رہی ہو گی۔ عین ممکن ہے کہ اس نے مجھے منیا پا کی لاش پر بیٹھے دیکھا ہو اور مشکوک ہو گیا ہو۔

دوپہر اور پھر شام کو میں وادیوں اور پہاڑیوں میں مٹر گشت کرتا رہا اور ندی نالوں سے بھی گزرا۔ کئی مرتبہ شیر کے پگ تو دکھائی دیے مگر شیر نہ دکھائی دیا۔

تین روز اسی طرح گزرے مگر کامیابی نہ ہوئی۔ چونکہ میرے پاس ایک ہفتے کی چھٹی تھی، سو اب میرے پاس چار دن باقی بچے تھے۔

اگلی صبح میں نے اپنا منصوبہ بدلا۔ ایک بڑی پہاڑی پر چڑھا اور میں نے پوری قوت سے شیر کی آواز نکالی۔ ہر دس منٹ بعد آواز نکالتا رہا کہ شاید شیر جواب دے۔ دو گھنٹے بعد میں نے یہی کام ایک اور پہاڑی پر کیا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ شام کو بھی یہی کام کیا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ میرا اندازہ تھا کہ شیر کہیں قریب موجود نہیں۔

پانچویں دن چرواہے مویشی لے کر گئے۔ آپ شاید اسے بہت بہادری کا کام سمجھیں مگر یاد رہے کہ مویشیوں کو پیٹ بھرنے کے لیے چرنے کے لیے جانا پڑتا ہے۔ اگر وہ چرائی کو نہ جائیں تو بھوکے رہ جائیں گے کہ ہمارے دیہاتوں میں چارے کو محفوظ رکھنے کا کوئی انتظام نہیں ہوتا۔

اگلی صبح میں چرواہوں کے ساتھ نکلا اور شام کو بھی یہی حرکت دہرائی۔ رات ہونے تک شیر کی موجودگی کا کوئی نشان نہ ملا۔ اگلی صبح میں بہت مایوس تھا۔ میرا خیال تھا کہ شیر اس علاقے کو چھوڑ چکا ہے۔ چونکہ میں کچھ اور نہ کر سکتا تھا، سو میں محض چرواہوں کے ساتھ ہی جاتا رہا۔

اس طرح میں اگلی صبح نکلا اور منیاپا کی ہلاکت کی جگہ سے آٹھ میل دور تھا کہ کچھ لوگ بھاگتے ہوئے آئے اور بتایا کہ تین میل دور ایک اور چرواہے پر حملہ ہوا ہے۔

میں ان کے ساتھ فوراً جائے وقوعہ پر پہنچا۔ اس بندے کے چہرے، پہلو اور سینے پر پنجوں کے زخم تھے مگر دانت کا کوئی نشان نہ ملا۔ اس بندے کا کافی خون بہہ چکا تھا اور چلنے کے قابل نہ تھا۔ سو میں نے ہمراہیوں سے کہا کہ وہ اسے اٹھا کر کار تک لائیں اور پھر میں نے اسے کار میں لٹا کر ستیا منگلم ہسپتال پہنچایا۔ پھر میں جائے وقوعہ کو لوٹا اور کار کو چھوڑ کر جنگل میں گھسا۔ اس جگہ خون کے نشانات سے میں اس جگہ تک پہنچا جہاں حملہ ہوا تھا۔

اس جگہ دیکھا کہ شیر نے کوئی مویشی ہلاک نہ کیا تھا کہ چرواہے پر حملے کے وقت سارے مویشی فرار ہو گئے تھے۔ شیر کی تلاش بہت مشکل ہوتی۔ میں نے ادھر ادھر تلاش کی اور شیر کی آواز نکالی۔ تاہم یہ دن بھی بیکار گیا۔

رات کو میں نے سوچا کہ پانچ میل تک سڑک پر گاڑی چلاؤں اور ٹارچ کی روشنی میں شیر کی چمکتی آنکھیں تلاش کرنے کی کوشش کروں۔ دس بجے میں نے سفر شروع کیا اور آہستہ آہستہ کار چلاتے ہوئے پانچ میل کا سفر طے کیا۔ پھر پندرہ منٹ رک کر واپسی کا رخ کیا۔ اس طرح چھ گھنٹے تک بار بار آنے جانے سے نہ صرف گاڑی کا پیٹرول کافی کم ہو گیا بلکہ مجھے بھی نیند آنے لگی۔

پھر میری چھٹی کا ساتواں اور آخری دن آن پہنچا۔ آخری حملے کے بعد چرواہوں نے مویشی لے جانا بند کر دیے تھے۔ میں نے اکیلے جنگل کا رخ کیا کہ شاید کہیں شیر دکھائی دے جائے۔ دوپہر کو میں کار سے چھ میل دور تھا، سو میں نے واپس کار کا رخ کیا۔

میں ایک پہاڑی سے اتر رہا تھا اور میرے سامنے ایک چھوٹا سا نشیب تھا اور دوسری جانب دوسری پہاڑی۔ اس وادی سے کوئی ندی نہیں گزرتی تھی اور کہیں کہیں ببول کے درخت بھی کھڑے تھے۔ اس کے علاوہ امبل وغیرہ جیسی خاردار جھاڑیاں بھی بکثرت تھیں۔ اچانک پچاس گز دور شیر امبل کی جھاڑی سے نکلا اور ہم ایک لمحے کو رک کر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر شیر نے ہلکی دھاڑ کے ساتھ جست لگائی اور امبل کی جھاڑی میں غائب ہو گیا۔

رائفل کو شانے سے لگا کر میں اس مقام پر پہنچا کہ شاید شیر موجود ہو۔ تاہم مجھے ناکامی ہوئی۔ شاید شیر کی چھٹی حس نے اسے بتا دیا تھا کہ سامنے اس کا شکار نہیں بلکہ شکاری ہے۔ سو اس نے راہِ فرار اختیار کی۔ میں نے اس جگہ تلاش کی پوری کوشش کی مگر شیر غائب ہو چکا تھا۔

اس طرح ساتواں دن ختم ہوا اور بنگلور واپسی کا وقت آن پہنچا۔

اگرچہ یہ آدم خور کے شکار کی ناکام اور ادھوری داستان ہے، مگر اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ آدم خور کے شکار میں ہر مرتبہ کامیابی ہی ہاتھ نہیں لگتی۔ ناکامی اور مایوسی بھی ملتی ہے۔ تاہم جنگل کے سب سے بہترین شکاری کے پیچھے اس کے فطری ماحول میں اس کو شکست دینے کے کھیل میں نہ صرف انسانی اعصاب بلکہ ذہانت کا بھی عمل دخل ہوتا ہے۔ اگرچہ دیہاتیوں کو شیر کے رحم و کرم پر چھوڑنے سے مجھے مایوسی تو ہوئی مگر دوسری جانب میں نے اپنی ہر ممکن کوشش کی تھی کہ انہیں آدم خور سے نجات دلاؤں۔ ویسے بھی میں عارضی طور پر واپس گیا تھا اور جونہی دوبارہ موقع ملتا تو میں لوٹ آتا۔

میں نے منیاپا کی بیوی کو ایک چیک دیا اور بنگلور واپسی کا رخ کیا۔ جنگل سے گزرتے ہوئے میں نے اس شیر کو داد دی کہ اس نے ہر موقعے پر مجھے شکست دی تھی اور یہ بات بھی راز ہی رہی کہ اس نے انسانوں کو کاٹنے اور بھنبھوڑنے کی بجائے پنجے مارنے کو ہی کیوں ترجیح دی تھی۔